حیات و کارنامے

سید سلیمان اشرف بہاری



تصنیف

محمد علی اعظم خاں قادری

رضوی کتاب گھر دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

المبین، النور، الارشاد، اظہار، الحج کے مصنف

اور

دنیائے سنیت کے عظیم ادیب و خطیب

سید سلیمان اشرف بہاری

حیات و کارنامے

تصنیف

محمد علی اعظم خاں قادری



رضوی کتاب گھر

23264524

ISBN- o1- 89201- 35- 5

کتاب	:	سید سلیمان اشرف بہاری
مصنف	:	محمد علی اعظم خاں قادری
ناشر	:	رضوی کتاب گھر، دہلی
باہتمام	:	(حافظ) محمد قمر الدین رضوی
سال اشاعت	:	۲۰۰۸ء
اشاعت اول	:	نومبر ۱۹۹۲ء
ناشر	:	مدرسہ شرف العلوم کولکاتا
تعداد	:	۱۱۰۰
صفحات	:	۸۰
قیمت	:	۳۰

انتساب

اپنے والد ماجد جناب

عبدالرزاق خاں قادری

کے نام!

جن کے فیض تربیت نے مجھے کسی لائق بنایا

محمد علی اعظم خان قادری

ناظم اعلیٰ مدرسہ شرف العلوم غریب نواز کولکاتا

فہرست مضامین

نگاہِ اوّلیں

حضرت علامہ سید رکن الدین اصدق صاحب بانی مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف

بحر العلوم حضرت مولانا سید سلیمان اشرف بہاری صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ صوبہ بہار کی نسبت سے بہاری نہیں بلکہ بہار شریف کی نسبت سے بہاری لکھے جاتے ہیں۔ آپ محلہ میرداد بہار شریف کے رہنے والے تھے جہاں آج بھی آپ کی عظیم الشان حویلی "اشرف منزل" آپ کے امیرانہ کروفر کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ آپ کے والد بزرگ اور والدۂ مخدومہ عظیم المرتبت عالم ربانی حضرت مولانا حافظ و قاری شاہ نور محمد اصدق الچشتی قدس سرہ کے جاں نثار مریدوں میں تھے۔ آپ دہلی کے رہنے والے اور سند السالکین قطب عالم حضور سیدنا خواجہ شاہ قیام اصدق چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دست بیعت اور ارشد خلفاء میں تھے۔

پیر و مرشد کے قرب کی نیت سے دہلی کو خیر باد کہکر بہار شریف آگئے تھے اور چھو محلہ میں مقیم تھے اور جب یہ دوری بھی گوارا نہ ہوئی تو آستانہ چشتی چمن پیر بیگھہ شریف آگئے اور یہیں اصدقی جنوبی کرے میں وصال فرمایا اور پیر کے سینتی میں مدفون ہوئے
آپ کے قیام بہار شریف کے زمانے میں حضرت مولانا سید سلیمان اشرف بہاری کے والدین حلقۂ غلامی میں شامل ہوئے اور اپنے سعادت مند بیٹے کو آپ کے حلقۂ درس میں داخل کیا۔ حضرت علامہ بہاری متوسطات تک آپ کے درس میں رہے اور آپ ہی کے دست حق پرست پر بیعت کی اور آگے چل کر اجازت و خلافت سے بھی سرفراز کئے گئے۔
حضرت علامہ بہاری کے علمی کارناموں کے تذکرے، اصدقی خاندان کے ساتھ گہری وابستگی

کے چرچے اور آستانہ چشتی چمن سے ان کی والہانہ عقیدت کے قصّے اپنے خاندانی بزرگوں سے بار بار سُنا تھا میرے حقیقی چچا حضرت حکیم سید شاہ قدیر الدین اصدق صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ ایک بار قیام لکھنؤ کے زمانے میں طبیہ کالج کی ضرورت سے میں علی گڈھ پہونچا۔ قیام کی سہولت اور کام کی آسانی کا خیال کر کے حضرت مولانا سید سُلیمان اشرف اصدقی البہاری علیہ الرحمہ کے در دولت پر حاضر ہوا ——— دستک دینے پر ملازم باہر آیا اور اس نے پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ میں نے کہا لکھنؤ سے۔ وہ اندر گیا اور پھر باہر آکر بولا کہ وقت ہو رہا ہے آفس میں مُلاقات کیجئے۔ میں نے کہا بہت اچھا اور کاغذ کی چیٹ پر لکھ کر دے دیا "قدیر الدین اصدق پیر بیگھہ شریف" چچا مرحوم فرماتے تھے کہ ابھی میں برآمدہ کے زینے سے اترا ہی تھا کہ حضرت برہنہ سر و پا گھر سے برآمد ہوئے اور میرا ہاتھ تھام کر فرمایا۔ بابو صاحب! میں معافی کا خواستگار ہوں۔ میں نے سمجھا کہ کوئی حاجتی ہوگا اس لئے آفس کا راستہ بتا دیا۔ ضرورت مند لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ آپ تو میرے آقازادوں میں ہیں۔ کاش! آپ نے لکھنؤ کی بجائے پہلے ہی پیر بیگھہ شریف بتا دیا ہوتا ——— اُس کے بعد مجھے اندر لے گئے اور بڑی پذیرائی فرمائی۔ دو دو دنوں تک میں آپ کا مہمان رہا۔

یہ وہی حضرت علامہ بہاری ہیں جن کے پندار علم اور شان خود داری کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے امراء اور حکام جب یونیورسٹی تشریف لاتے تو سامنے رکھی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کا حکم فرماتے اور خود اپنی جگہ چھوڑنا تو در کنار ذرا سی حرکت بھی نہ فرماتے مگر کم درجہ علماء کی بھی قدر کرتے اور نو عمر پیرزادوں کے سامنے ادب احترام کا مجسمہ نظر آتے تھے ——— آج میں نے ایک ایسی کتاب کا تعارف لکھنے کے لئے قلم اٹھایا ہے جو اُن ہی کی حیات اور خدمات پر لکھی گئی ہے۔

مولانا محمد علی اعظم خاں قادری صدر مجلس طلباءِ اسلام مظفر نگر کا نہ تو سلسلۂ تلمذ

بحر العلوم حضرت مولانا سید سلیمان اشرف اصدقی البہاری علیہ الرحمہ سے ملتا ہے اور نہ آپ ان کے خاندان و وطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب کے پیچھے مرتب کا جو اصل جذبہ کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی جامع اور ہمہ گیر شخصیت جس کا فیضان علم مسلم یونیورسٹی کے تعلق سے پورے ملک کو محیط ہے اور جس کے ملی اور جماعتی کارناموں کے سبب آج تک سواد اعظم اہل سنت کی کلاہ افتخار اونچی ہے اور جس کی سحر بیانی اور قادر الکلامی کے آگے غیروں کا ناطقہ سر بگریباں تھا اس کی حیات اور خدمات سے دنیا کو پورے طور پر روشناس نہیں کرایا گیا۔ اپنے اکابر کی حیات و خدمات سے موجودہ اور آئندہ نسلوں کو متعارف کرانا اہل سنت کے قلم کاروں کی جماعتی ذمہ داری ہے مولانا محمد علی اعظم خاں نے اپنی اسی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کامیاب کوشش فرمائی ہے۔

ملک العلماء حضرت مولانا شاہ محمد ظفر الدین رضوی البہاری اور بحر العلوم حضرت مولانا سید سلیمان اشرف اصدقی البہاری صوبہ بہار کی یہ دو ایسی قدر آور شخصیت ہیں جو کسی نہ کسی رخ سے اپنے تمام معاصرین پر تفوق رکھتی تھیں اور جن کا علمی دبدبہ اغیار بھی محسوس کرتے تھے۔ دانشوروں کی دنیا میں ان کے فنی کمال کا سکہ چل رہا تھا ——— الٰہ آباد کے اندر تمام مذاہب کے نمائندوں کی موجودگی میں گاؤکشی کے مسئلہ پر پنڈت مالویہ سے حضرت علامہ بہاری کا تاریخ ساز مکالمہ اس کا روشن ثبوت ہے۔

پٹنہ ٹریننگ اسکول کی مسجد میں اوقات الصلوٰۃ کے موضوع پر غیر مقلدین کے پیشوائے اعظم مولوی عبد الخبیر صادق پوری سے حضرت فاضل بہاری کا علمی مباحثہ اب تک لوگوں کو یاد ہے۔ آپ کی شوکت علمی کے آگے کھلے عام مولوی عبد الخبیر ——— نے سپر ڈال دیا تھا ——— یہ دونوں ہی بزرگ اونچے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ افلاس و تنگ دستی انھیں چھو نہ سکی تھی اس لئے مالی منفعت سے بے نیاز ہو کر ملت اسلامیہ کی بے لوث خدمات انجام دیتے رہے تھے مگر نہ جانے کیوں ان دونوں ہی کے تعارف

سے پہلوتہی برتی گئی اور ان کی زرین خدمات پر گمنامی کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔
قابل مبارکباد اور لائق صد ستائش ہیں مولانا محمد علی اعظم خان قادری جنہوں نے اپنی بساط اور معلومات کے مطابق بحر العلوم حضرت علامہ سید سلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ کی عبقری شخصیت کے تعارف کا بیڑہ اٹھایا ہے اور مختلف مضامین و مقالات سے اخذ کر کے یہ گلدستہ آپ تک پہونچانے کی سعی کی ہے جس کے مطالعہ کے بعد آپ بہت حد تک اپنے ایک عظیم دینی رہنما کو جان سکیں گے۔

سید رکن الدین اصدق
مہتمم مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف بہار شریف
۱۰ محرم الحرام ۱۴۱۳ھ

کچھ مصنف کے بارے میں

از حضرت مولانا صلاح الدین نادر پوکھریروی

زیر نظر تصنیف "سید سلیمان اشرف بہاری" مصنف کا خود ہی ایک تعارف اور ان کی خصوصیات کا ترجمان ہے۔ اس کے باوجود مصنف کا مختصر سوانحی خاکہ قارئین کرام کی نذر ہے۔

تصنیف ہٰذا کے مصنف کا نام محمد علی اعظم ہے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی عبدالرزاق خاں ہے۔ آپ صوبۂ بہار جس نے ایک سے ایک نامور ادیب، شاعر، محقق، مصنف، ناقد اور دانشور کو جنم دیا۔ اسی زرخیز صوبے کے ضلع چھپرہ موضع کوڑیاں پوسٹ شیتل پور میں مورخہ ۲۷ر جنوری ۱۹۵٦ء مطابق ۶ر رجب المرجب ۱۳۷۵ھ کو پیدا ہوئے۔

آپ کے والد جو ایک صوفی صفت انسان ہیں حضرت صوفی عبدالغفور تیغی قادری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہیں۔ بہت دنوں تک آپ کو کوئی لڑکا نہ ہوا تو آپ نے اپنے پیر و مرشد سے دعا کی درخواست کی۔ پیر و مرشد کی دعا اپنے مرید خاص کے حق میں رنگ لائی اور مصنف موصوف کا تولد ہوا۔ موصوف کے تولد سے چند روز قبل حضرت صوفی عبدالغفور تیغی قادری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے والد گرامی کو خبر بھجوائی کہ چند روز بعد تمہیں ایک لڑکا نصیب ہونے والا ہے جس کا نام محمد علی اعظم رکھنا۔ آپ کے والد گرامی نے اپنے پیر و مرشد کے حکم کے مطابق آپ کو محمد علی اعظم کہنا شروع کیا اور یہی مستقل نام ہو گیا۔

اب چونکہ آپ کو مدرسے سے دینی تعلیم کی سند حاصل ہے اور خان برادری سے تعلق رکھتے ہیں پھر حضرت صوفی شاہ محمد اسمٰعیل رضوی قادری اورنگ آبادی (خلیفۂ حضور مفتی اعظم ہند نوری بریلوی رحمۃ اللہ علیہ) سے شرف بیعت حاصل ہے۔ اس لئے اب ہر جگہ مولانا محمد علی اعظم خان قادری کے ساتھ متعارف ہیں۔

حصول تعلیم

موصوف نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن مالوف میں حاصل کیا پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے کلکتہ تشریف لائے۔ یہاں مدرسہ عالیہ میں داخلہ لیا۔ کچھ دنوں یہاں رہے اسی درمیان کچھ نامساعد حالات کے تحت سلسلۂ تعلیم منقطع ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد حالات سازگار ہوئے تو مدرسہ عین العلوم کلکتہ میں داخلہ لیا اور تا فراغت یہیں رہے۔ عین العلوم کی سند کے علاوہ موصوف نے جامعہ علیگڑھ سے ادیب ماہر ادیب کامل کی سندیں بھی حاصل کیں اور مغربی بنگال سکنڈری بورڈ سے دو بار میٹرک کے لئے فارم فلپ کیا اور ٹیسٹ میں کامیابی بھی حاصل کی لیکن دونوں دفعہ فائنل کا فارم فلپ کر کے ناسازگاری حالات کی وجہ سے شریک امتحان نہ ہو سکے۔ پہلی بار والدہ کی طبیعت خراب ہونے کی بنا پر وطن جانا پڑا دوسری بار بھی اسی قسم کا کوئی مرحلہ سامنے آگیا۔ حصول تعلیم سے فراغت کے بعد بھی مولانا نے کلکتہ کو نہیں چھوڑا۔ بلکہ مادر علمی نے جو تصنیف و تالیف کا درس دیا تھا اور ان کی لمبی انگلیوں کو ایک اچھا قلم تھمایا تھا اس کی مشاقی اور قلم کی روانی کے لئے موصوف نے کلکتہ ہی کی علمی ادبی فضا کو منتخب کیا۔ اور مسلسل کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ کبھی رسائل و جرائد کے لئے مضامین و مقالات تو کبھی اخباروں کے لئے اطلاعات و مراسلات اور پھر جیسے ہی لکھنے کی صلاحیت جوانی کے عالم میں پہونچی تصنیف و تالیف کیلئے بھی کمربستہ ہو گئے۔ اس طرح موصوف نے اپنے ہونہار قلم میں نہ تو زنگ لگنے دیا نہ کبھی اس کو تھکاوٹ کا شکار ہونے دیا۔

نکاح

مولانا کے والدین دورانِ تعلیم ہی آپ کا نکاح کرنا چاہتے تھے لیکن مولانا کی قطعی خواہش نہیں تھی کہ ابھی نکاح ہو پھر بھی والدین کی بے پناہ خواہشوں اور اصرارِ بسیار کے آگے جھکنا پڑا اور اپنے ہی وطن میں جناب محمد سلیم خان صاحب کی صاحبزادی فیروزہ خاتون کے ساتھ ۸ر دسمبر ۱۹۸۱ء میں آپ کا نکاح کر دیا گیا۔

ذریعہ معاش

مسائلِ زندگی میں معاش کا مسئلہ ایک بہت ہی ٹیڑھا اور اہم مسئلہ ہے۔ ہر شخص کو اس کی گتھی سلجھانی پڑتی ہے گرچہ بعض اوقات انسان ان گتھیوں کو سلجھانے میں خود الجھ کے رہ جاتا ہے اور اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا جنازہ اسے خود اٹھانا پڑتا ہے۔ لیکن ایسے میں یقیناً لائقِ صد آفریں ہیں جو اس مسئلہ کے حل کے ساتھ ساتھ اپنی دیگر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ مولانا بھی ان ہی لوگوں میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنا ذریعہ معاش درس و تدریس کو بنایا۔ مختلف جگہوں پہ آپ نے یہ فرائض انجام دیئے۔ تقریباً ۴ سال مسجد سٹوڈنٹس ہیلتھ ہوم نمبر ۱۴۸/۱ اچاریہ جگدیش چندر بوس روڈ کلکتہ ۱۴ میں بھی منصبِ امامت و خطابت پہ فائز رہے۔ مسجد کی ملازمت کے دوران ہی ار توپسیا روڈ ساؤتھ کلکتہ ۴۶ میں اہلِ محلہ کے تعاون سے مدرسہ شرف العلوم غریب نواز قائم کیا۔ فی الحال اسی میں بحیثیت ناظمِ اعلیٰ خدمت کر رہے ہیں۔ یہ مدرسہ سلطان المحققین شیخ الاسلام والمسلمین مخدومِ جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی یاد میں ہے جس کی بنیاد خلوص و محبت اور دینی خدمات کے جذبات پہ رکھی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ آج یہ مدرسہ تیزی کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ مولانا نے اس کا افتتاح تنہا الف زبر آ، ب زبر بَ سے کیا لیکن بحمدہ تعالیٰ آج یہ مدرسہ اپنی کم عمری کے باوجود حافظ بھی بنا رہا ہے اور عربی، اردو، انگلش، ہندی [illegible] عصری تعلیم سے بھی بچوں کو آراستہ کر رہا ہے۔ مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے طعام و قیام کا بھی انتظام مدرسہ کے ذمہ ہے۔ اگر ایسے ہی خلوص اور دینی

جذبات ہمیشہ رہے تو انشاء اللہ الرحمٰن مستقبل قریب میں ہی اشرف العلوم کو یگانۂ روزگار ادارہ کا شرف حاصل ہوگا۔

مولانا ایک اچھے جادو بیاں مقرر بھی ہیں ـــــ ماشاء اللہ موصوف بہت ہی پر زور اور عالمانہ تقریر فرماتے ہیں۔ جس کی وجہ سے تقریری میدان میں کافی مقبولیت ہوگئی ہے۔ اور ملک کے ہر حصے میں آپ کو تقریر کیلئے مدعو کیا جاتا ہے۔

اخلاق وعادات

میری پہلی ملاقات مولانا سے اجنبیت کے میدان میں ہوئی لیکن مولانا کے اخلاق نے بہت جلد مجھے اس میدان سے نکال کر محبت، اخوت اور بھائی چارے کے ایسے ماحول میں کھڑا کردیا جہاں اجنبیت نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی بلکہ برسوں کی شناسائی کا گماں ہوتا تھا۔ پھر ہم دونوں ایک ہی ساتھ رہنے لگے۔ کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ کیا مولانا کو زمانے کی ہوا نہیں لگی کہ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے مجھ کو اتنا قریب کرلیا؟ لیکن معلوم ہوا ایسی بات نہیں ہے بارہا آپ کو دوستوں کے بھیس میں دشمنوں سے سابقہ پڑا ہے لیکن اس سے آپ کی خوش خلقی ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی۔ بلکہ ہمیشہ سب سے ٹوٹ کے ملتے رہے۔ اور آپ سے ملنے والا ہر شخص اپنے آپ کے بارے میں یہی سوچتا رہا کہ مولانا مجھ سے ہی سب سے زیادہ خندہ پیشانی اور قریب سے ملتے ہیں۔ حالانکہ ایسی بات نہیں مولانا کے حسن اخلاق اور خلوص و محبت کا فیض بزرگوں کی خانقاہ کی طرح بلا امتیاز سب کے لئے عام ہے۔ اور یہی چیز ان کی ہر دل عزیزی کا سبب ہے ـــــ غرور و گھمنڈ کا تو شائبہ تک نہیں، مزاج میں بھی کافی سادگی تصنع اور بناؤ سنگار سے دور کا بھی واسطہ نہ کبھی رہا نہ ہے۔ جسم کے سنوارنے کی طرف موصوف نے کبھی دھیان دیا ہی نہیں ہاں دل کی آراستگی کا پورا خیال رکھتے ہیں۔

علماء کی صحبت

مولانا کو بچپن ہی سے علمائے کرام سے گہری عقیدت رہی۔ اور قسمت سے اجلہ علمائے کرام کی صحبت اور ان کی خدمت

کا موصوف کو ہمیشہ موقع بھی ملتا رہا۔ خاص کر مجاہد ملت حضرت علامہ مولانا محمد حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور خطیب مشرق پاسبان ملت حضرت مولانا مشتاق احمد نظامی علیہ الرحمہ کے بہت ہی زیادہ قریب رہے۔ اور ان کی تعلیمات و فیضان صحبت اور نیک دعاؤں سے بہرہ ور ہوتے رہے۔ آج بھی اپنے علماء کی قدر موصوف کے دل میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

پاسبان ملت علیہ الرحمہ نے مولانا کی صلاحیت، سرگرمی اور خدمت دین کے جذبہ کو دیکھ کر آل انڈیا سنی تبلیغی جماعت شاخ مغربی بنگال کا امیر جماعت بھی بنا دیا تھا۔ مذکورہ دونوں بزرگوں نے مولانا موصوف کو اپنے قریب ترین عزیزوں میں سمجھا اور آپ کے کشت دل پر شفقتوں کی برسات فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف آج تیزی سے ہر طرف چلتے پھولتے نظر آرہے ہیں۔

اولیائے عظام سے عقیدت

موصوف اولیائے عظام علیہم الرحمہ والرضوان سے بھی بہت ہی گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ ہمیشہ بزرگوں کے مزارات پُرانوار کی زیارت اور وہاں نذرانۂ عقیدت پیش کرنا مولانا کا معمول بنا ہوا ہے۔ دوسروں کو بھی اولیائے کرام کی بارگاہ میں نیازمندی پیش کرنے اور فیضان حاصل کرنے کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ آپ کی تصنیفات بھی اولیاء کرام کے حالات و تعلیمات پر مشتمل ہیں جن سے اولیاء کرام سے مولانا کی عقیدت تراوش کرتی ہے۔

تنظیمی سرگرمیاں

مولانا کے ہمدرد سینہ میں ہمیشہ تنظیمی خدمات اور کسی تنظیم سے منسلک رہ کر قومی خدمات کرنے کے جذبات موجزن رہے۔ لہٰذا کافی دنوں تک موصوف نے پاسبان ملت علیہ الرحمہ کی عنایت کردہ تنظیم آل انڈیا سنی تبلیغی جماعت کی خدمات کی اور دور دور تک اس کی شہرت کرائی۔ ممبروں کی اچھی خاصی ٹولی ہو گئی اور سب کی مشترکہ کوششوں سے بہت سارے کارہائے نمایاں

انجام دیئے۔ خاص کر ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۸ء میں دو روزہ تاریخی آل انڈیا سُنّی تبلیغی جماعت کانفرنس کروائی جس میں تقریباً تمام مقامی علماء کے علاوہ ملک کے چوٹی کے علماء، شعراء اور دانشور حضرات نے شرکت کی تھی۔ اس جلسے کا عوامی ذہن پر اچھا اثر پڑا۔ بہت سارے دلوں سے اِسلام و سُنّیت سے متعلق شکوک و شبہات دُور ہو گئے لیکن بد قسمتی سے دوسری بہت سی تنظیموں کی طرح آل انڈیا سُنّی تبلیغی جماعت مغربی بنگال کا بھی شیرازہ بکھر گیا اور یہ تنظیم بھی نقطۂ زوال پہ پہنچ گئی ——— مگر مولانا کا تنظیمی جذبہ جوان ہی رہا اس میں ضعیفی کی کوئی علامت نہیں دیکھی گئی۔ فوراً ہی اپنے معاونین کی بے وفائی کی شکایت کئے بغیر طلباء اور نوجوانوں کی سرگرم تنظیم کل ہند مجلس طلبائے اِسلام (ایم ٹی آئی) سے منسلک ہو گئے۔ یہاں مولانا کو ان کی گذشتہ کارکردگیوں کا جائزہ لے کر مغربی بنگال صوبائی سطح کا صدر بنا دیا گیا۔ آج تک اسکی ذمہ داری آپ ہی کے ذمہ ہے۔ موصوف اپنی ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے مجلس کو عروج کی طرف لے جانے کی ہر ممکن کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ خدا اس تنظیم کو صحت اور طول عمری کی نعمت سے مالا مال فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

تصنیفات

مولانا کی پہلی تصنیف "تجلّیات شرف" ہے جو مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدّین احمد یحییٰ منیری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سوانح حیات ہے۔ اس تصنیف نے مولانا کو کافی شہرت و مقبولیت اور حوصلہ بخشا۔ اہل علم حضرات کے حلقہ میں یہ تصنیف کافی سراہی گئی۔ اس پہ تبصرہ کرتے ہوئے جناب کمال جعفری (ڈپٹی ایڈیٹر آل انڈیا ریڈیو دہلی) و مدیر ماہنامہ "مخدوم جہاں" دہلی "مخدوم جہاں" کے نومبر، دسمبر ۱۹۸۸ء کے شمارہ میں لکھتے ہیں:۔

مولانا محمد علی اعظم خان صاحب کو حضرت مخدوم جہاں سے والہانہ عقیدت و محبت ہے انھوں نے اس کتاب میں مختصراً وہ سب کچھ مواد فراہم کر دیا ہے جس کی مدد

سے ایک ادنی سا علم داں حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے حالات اور علمی کارناموں سے کما حقہ آشنا ہو سکتا ہے۔ تجلیات شرف کتابت وطباعت اور مضامین کے نقطۂ نظر سے نہایت جاذبِ نظر ہے۔ مصنف نے حضرت مخدوم جہاں کی تصانیف کا براہ راست مطالعہ کیا ہے اور ان پر لکھی گئی کتابیں مثلاً تاریخ سلسلۂ فردوسیہ اور سیرت الشرف سے خاص مدد لی ہے۔ جس سے مصنف کے علمی ذوق وشوق اور مرتبے کا پتہ چلتا ہے۔ اولیائے کرام سے جذباتی تعلق اور عشق نے مولانا موصوف کو اپنے ہم عصروں میں ایک نمایاں مقام عطا کر دیا ہے۔ جس کی جھلک زیر نظر تصنیف میں دیکھی جا سکتی ہے۔ طالبانِ مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے لئے یہ ایک بیش بہا تحفہ ہے جس کی پذیرائی ضروری ہے۔ خدا مصنف کے حوصلے کو اور بلند کرے کہ ابھی ان سے مزید اچھی تصنیفات کی توقع ہے"۔

مولانا آرزو اشرفی گیاوی "تجلیات شرف" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:۔

"ہمارے فاضل گرامی مولانا محمد علی اعظم خاں قادری رضوی مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے بڑی کاوش، تلاش وجستجو اور عرق ریزی سے زیر نظر کتاب "تجلیاتِ شرف" مرتب کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اس کتاب میں سرکار مخدوم الملک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات، کشف وکرامات اور ان کی نورانی تعلیمات کے جواہر پارے بڑی دیدہ ریزی سے موجود کئے گئے ہیں۔ اور اس کے اوراق جس قسم کے گلہائے مضامین سے آراستہ ہوئے ہیں وہ عصری تقاضے کو پورا کرتے ہوئے خواص وعوام کو دعوت مطالعہ دیتے ہیں"۔

پیر طریقت حضرت مولانا سید رکن الدین اصدق صاحب مہتمم مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف بہار شریف کلمات اولیں کے تحت حضرت مخدوم جہاں رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظمت و رفعت پہ ہلکی روشنی ڈالنے کے بعد لکھا کہ "یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا نے حضرت مخدوم پر لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ ہاں! یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مخدوم کیساتھ ان کے عشق واخلاص کے جذبۂ صادق نے انھیں سرکار مخدوم کے مدحت گذاروں کی

صف میں لاکھڑا کیا ہے۔ بلاشبہ ان کا یہ عقیدت مندانہ عزم اور حوصلہ اور مذہبی سرور و عشق قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے ـــــــ ہمیں اُمید ہے کہ یہ کتاب نفع خلق کا باعث بنے گی۔

مولانا کی دوسری کتاب "روشنی کے مینار" حصہ اوّل ہے۔ اس میں چند ایسے اولیائے کرام سے متعلق مضامین ہیں جن سے عوام تو عوام بہتیرے خواص بھی ناواقف تھے، اور بعض شہرۂ آفاق شخصیت کے بھی حالات و کوائف بیان کیے گئے ہیں۔ پہلی تصنیف کی طرح اس کی بھی کافی پذیرائی ہوئی۔ اور مصنف کو داد و تحسین سے نوازا گیا۔

مفکر اسلام علامہ و ڈاکٹر طہٰ حسن رضا خان پروفیسر ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

پیش نظر کتاب "روشنی کے مینار" بظاہر چند شخصیتوں کا مختصر سا خاکہ ہے مگر اپنی اثر پذیری اور ہمہ گیری کے اعتبار سے مینارۂ ہدایت ہے، اور اپنی انفرادیت کے اعتبار سے ایک طویل عرصہ پر محیط ہے۔"

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب موصوف اس کتاب میں مندرج مضامین کے عناوین کو گناتے ہوئے یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

" مذکورہ بالا عناوین پر تحقیقی مواد پیش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مگر مولانا محمد علی اعظم خاں قادری نے اپنی انتھک کاوشوں سے اس راہ میں ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ جو ہر و تحقیق کو یہ ذہن دے رہا ہے کہ تحقیق کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا ہے اور کاروانِ تحقیق کی کوئی منزل نہیں ہوتی ہے۔ ہر منزل جدید تحقیق کی نئی راہیں کھولتی ہے اور ہر منزل دوسری منزل کے لئے نشانِ راہ بنتی جاتی ہے۔ ہر معلوم کسی مجہول کی طرف اشارہ کرکے کاروانِ شوق کے لیے مہمیز بن جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جائے کہ یہ کتاب علمی ادبی اور تحقیقی مضامین کا ایک گنج گرانمایہ ہے۔"

اس طرح مولانا موصوف کی ہر تصنیف قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ اور مجھے اُمید ہے کہ زیر نظر تصنیف "سید سُلیمان اشرف بہاری" کو بھی ایک بیش بہا تحفہ سمجھ کر قبول کیا جائے گا ——— اس کی فنی خوبی اور خامی کے پرکھنے کی صلاحیت تو میرے اندر نہیں ہے لیکن اساتذہ کرام اور پیر و مرشد فیضان اعلیٰ حضرت آبروئے سُنّیت مفتی اعظم حضرت علامہ محمد اختر رضا خاں ازہری مدظلہٗ العالی (جن کی نگاہ عنایت نے ذرّہ ناچیز کو نادر بنا دیا) کی شفقتوں اور نوازشوں کا ثمرہ ہے کہ کچھ پڑھ لکھ لیتا ہوں۔ وہ بھی مولانا موصوف کی تصنیفات کو تو با آسانی پڑھ لیتا ہوں اور کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ کیوں کہ مولانا نے مجھ جیسے کم علموں کا پورا خیال کیا ہے اور اپنے وضع قطع میں سادگی کے ساتھ اپنی طرز تحریر میں بھی سادگی کو جگہ دی ہے۔ اور یہی سادگی ان تصنیفات کے حُسن کو دوبالا کر دیتی ہے کیونکہ ع "سادگی بھی تو قیامت کی ادا رکھتی ہے"

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس کی اہمیت و افادیت آفتاب نیم روز کی طرح روشن ہو جاتی ہے ——— موصوف نے مولانا سید سُلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمۃ والرضوان کی زندگی کے تقریباً ہر شعبہ پہ کچھ نہ کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح یہ کتاب مولانا سید سُلیمان اشرف بہاری کی حیات اور کارناموں پہ مشتمل ہے۔ جس کی موصوف نے انتہائی کدوکاوش اور تحقیق و تفتیش کے بعد تصنیف کی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا نے سید سُلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ کی سوانح حیات لکھ کر بہت بڑا کام کیا ہے۔ کیوں کہ اس قسم کی کتاب سید صاحب علیہ الرحمہ پہ شاید اب تک نہیں لکھی گئی۔ جبکہ بہت پہلے لکھی جانی چاہئے کیونکہ سید سُلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ کی شخصیت مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے جس سے بے شمار بھٹکے ہوؤں کو روشنی ملتی ہے۔

لیکن یہ سہرا مولانا کے سر کا تھا اس لئے اللہ رب العزت نے ان سے یہ

اہم کام لے کر ان کا مقام بلند و بالا کر دیا اور اس لائق بنا دیا کہ اب یہ اپنے آپ کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ ؎

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

صلاح الدین نادرؔ
(پوکھریری)



اِفتتاحیہ

صوبۂ بہار علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی میدان میں اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے۔ شروع ہی سے یہاں بڑی بڑی نامور اہم شخصیتیں جنم لیتی رہی ہیں۔ اس کثیر الاضلاع صوبہ کو ترقی کی سمت بڑھنے میں ہر جانب سے مدد ملی کیونکہ تقریباً اس کے ہر شہر، ہر ضلع میں کسی نہ کسی ایسی شخصیت کا وجود ہوا جس نے اپنے وطن مالوف کے عظیم گلشن کو سجانے اور نکھارنے میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا ـــــ گرچہ یہ صوبہ مختلف المذاہب لوگوں کا مسکن ہے لیکن اس کے باوجود اس کے ماضی کا اتحاد قابلِ رشک ہے۔ اور درحقیقت بہار کو پُر بہار بنانے میں اسی اتحاد کا ہاتھ ہے۔ اور اس اتحاد کے بحال کرنے کے پس پشت علماء کرام اور صوفیائے عظام کی تعلیمی خدمات اور رُوحانی فیوض وبرکات کارفرما ہیں۔ جیسا کہ بہار کی تاریخ گواہ ہے کہ شروع میں یہاں دُور دراز سے پہاڑوں، جنگلوں اور لق ودق میدانوں کے سینوں کو چیرتی ہوئی صوفیائے کرام کی متبرک جماعت اترتی رہی اور دعوت وتبلیغ کے ذریعہ ایک دل کو دوسرے دل سے جوڑنے کا کام انجام دینے میں مشغول رہی۔ اس لئے بہار کو ترقی دلانے میں صوفیائے کرام کے جو خدمات ہیں انہیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ خاص کر اس گلہائے رنگ سے مزین چمنستان کو سینچنے اور سنوارنے میں منیر شریف اور بہار شریف کی نابغۂ روزگار

شخصیتوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے، کیوں کہ ہمیشہ اس سرزمین پہ صوفیا، علما، فضلا کی ایک خاص جماعت موجود رہی ہے اور دلوں کو جوڑنے اور تبلیغ و تلقین کے ذریعہ انسانی دنیا کو انسانیت سے آراستہ و پیراستہ کر کے مقصد حیات سے روشناس کرانے میں سرگرم عمل رہی۔

بہار شریف بہار شریف یوں تو ہمیشہ گہوارۂ اولیاء عظام و علمائے اسلام رہا ہے لیکن اس کی شہرت عالم اسلام کے جلیل القدر صوفی بزرگ مخدوم جہاں سلطان المحققین شیخ الاسلام والمسلمین شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری ثم بہاری رضی اللہ عنہ کے وقت سے ہوئی۔ آپ ۵۲ برس تک اس سرزمین پر ظاہری رشد و ہدایت، تبلیغ و تلقین فرماتے رہے اور آج بھی پردہ فرمانے کے تقریباً سات سو سال گذر جانے کے باوجود خلق خدا کو اپنی روحانیت سے فیضیاب فرما رہے ہیں جس کا ثبوت مزار اقدس پہ اُمنڈتا ہوا انسانی سیلاب ہے۔

مخدوم الملک علیہ الرحمہ والرضوان کے علاوہ گذشتہ آٹھ سو برسوں میں اس معدن اولیاء شہر بہار شریف میں ایک پر ایک باکمال اکابر اولیاء عظام اور علمائے اسلام جلوہ افروز ہوئے اور اپنے تبلیغی مشن میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے لیکن یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ ہم نے اپنے اکثر روحانی پیشوا کو بھلا دیا ہے جبکہ اگر ان کی شخصیت اور کارناموں پہ کام کیا جاتا تو ضخیم کتابیں تیار ہو سکتی تھیں۔ چند اولیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جن کے متعلق مجھے پرانی کتابوں سے کچھ معلومات حاصل ہوئے ہیں ان کے مختصر حالات لکھنے کی سعادت کی ہے اس واسطے ؎

چھیڑ لیتے ہیں پروانوں کا افسانہ
شاید تیرے کانوں میں پیغام عمل جائے

حضرت مخدوم چرم پوش تیغ برہنہ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مخدوم احمد چرم پوش علیہ الرحمہ۔ مخدوم جہاں رضی اللہ عنہ کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ آپ حسینی سیّد ہیں۔ آپ شہر ہمدان کے رہنے والے تھے جو ایران کا مشہور شہر ہے۔ آپ کی پیدائش سنہ ۶۵۱ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد نے جب بادشاہی ترک کر کے درویشی اختیار کی تو آپ تخت نشین ہوئے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد آپ کا دل بھی اچاٹ ہو گیا اور فقر و درویشی کی طرف رغبت بڑھی۔ لہٰذا آپ نے بھی تخت شاہی کو ٹھوکر مار کر درویشی اختیار کر لی۔ اور تبت، ملتان کی سیاحت فرماتے ہوئے سیوان (بہار) تشریف لائے۔ وہاں ایک بزرگ حسن پایئے رحمۃ اللہ علیہ مدت دراز سے آپ کے منتظر تھے کہ حضرت تشریف لائیں گے تو مُرید ہوں گے۔ چنانچہ آپ نے انھیں بیعت کیا اور ان سے کہا کہ حضرت اسماعیل علیہ السّلام کی قُربانی کے بدلے جو دُنبہ ذبح کیا گیا تھا اس کا چمڑا آپ کے پاس ہے لہٰذا اس میں سے مجھے بھی دیا جائے۔ انہوں نے آپ کو دیا۔ آپ نے اسے گردن میں ڈال دیا اور اسی وقت سے چرم پوش کے لقب سے مشہور ہوئے۔ وہاں سے آپ بہار شریف تشریف لائے اور رشد و ہدایت تبلیغ و تلقین میں لگے رہے اور بے شمار خلق خدا کو فیض یاب فرمانے کے بعد ۷۷۶ھ میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ صوبہ بہار میں فارسی کے سب سے پہلے صاحبِ دیوان صوفی شاعر گذرے ہیں۔ آپ کا مزار پاک محلہ عنبیر (بہار شریف) میں ہے۔ آپ کے والد ماجد حضرت سُلطان محمد کاظم ہمدانی کا مزار پاک بھی بہار شریف میں ہے۔

حضرت مخدوم شیخ حسین نوشہ توحید رحمۃ اللہ علیہ

آپ حضرت شیخ معیز الدین بلخی کے صاحبزادے ہیں اور مولانا مظفر بلخی کے بھتیجے آپ حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاری علیہ الرحمۃ کے تربیت یافتہ مرید و خلیفہ تھے۔ مخدوم الملک آپ پر بے حد شفقت برتتے تھے۔ مولانا مظفر بلخی علیہ الرحمۃ کے وصال کے بعد خانقاہ معظم میں مسند سجادگی پر بیٹھے اور چھپن سال تک لوگوں کو ہدایت اور تبلیغ و تلقین فرماتے رہے۔ بالآخر ۲۲ ذی الحجہ ۸۴۴ھ کو آپ کا وصال ہوا۔ آپ کا مزار شریف مخدوم جہاں کے آستانہ کے قریب محلہ بہار پور میں ہے۔

حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ

آپ کو سلطان محمد تغلق نے سپہ سالار بنا کر بہار بھیجا تھا۔ آپ نے بہار کو فتح کیا اس لئے فاتح بہار کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ جہاں بڑے بہادر اور غازی تھے وہیں عبادت گزار اور شب بیدار بزرگ بھی تھے۔ آپ سرکار غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد سے ہیں۔ سلطان کے حکم سے آپ دلی سے مع لشکر مسلسل سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے بہار پہونچے اور دشمنوں سے دلیرانہ مقابلہ کیا۔ قلعہ فتح ہو گیا۔ آپ قلعہ سے باہر تشریف لا رہے تھے کہ چند چھپے ہوئے افراد نے آپ پر اچانک حملہ کر کے شہید کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۳ ذی الحجہ ۷۵۳ھ کا ہے۔ آپ کا مزار پاک بہار شریف میں پہاڑ کے اوپر واقع ہے۔

حضرت پیر بدرِ عالم رحمۃ اللہ علیہ

آپ میرٹھ میں قیام پذیر تھے اور رشد و ہدایت کا کام انجام دے رہے تھے کہ مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو بہار شریف آنے کا حکم دیا۔ حکم کے مطابق حضرت پیر بدرِ عالم علیہ الرحمہ بہار شریف تشریف لے آئے۔ مگر آپ کی آمد بہار سے پہلے حضرت مخدوم الملک کا وصال شریف ہو چکا تھا۔ جس کا حضرت بدر عالم علیہ الرحمہ کو بہت افسوس اور غم ہوا۔ حضرت مخدوم جہاں رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر چلہ کشی کرنے لگے۔ چلہ کشی کے بعد دیگر مقامات کا سفر کیا اور پھر سے مستقل طور سے بہار شریف میں سکونت اختیار کر لی اور خلق خدا کو فیض یاب فرمانے لگے۔

آپ کی شادی سلطان فیروز شاہ کی لڑکی سے ہوئی تھی جن کے بطن سے چار لڑکے اور ایک لڑکی بی بی ابدال ہوئیں۔ ۲۷ رجب المرجب ۸۴۴ھ کو آپ اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔

آپ کا مزار پاک محلہ تکیہ کلاں میں واقع ہے۔

حضرت شاہ عطاء اللہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

آپ حضرت غوث الاعظم کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کی ولادت باسعادت بغداد شریف میں ہوئی۔ ظاہری علوم کی فراغت کے بعد آپ اپنے والد ماجد سے بیعت ہوئے۔ آپ کے والد نے آپ کو اجازت و خلافت عطا کیا۔ مختلف ممالک کی سیاحت کرتے ہوئے

آپ ہندوستان تشریف لائے۔ حضرت مخدوم الملک رحمۃ اللہ علیہ کا شہرہ سُن کر بہار شریف تشریف لائے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ آپ کا وصال [illegible] میں ہوا۔ آپ کا مزار آبادی سے کچھ دور پیر شاہ گھاٹ میں واقع ہے۔

آپ ہی کی ذات سے صوبۂ بہار میں سب سے پہلے سلسلۂ قادریہ کی اشاعت ہوئی۔ آپ کو حضرت نور قطب عالم پنڈوی سے بھی اجازت و خلافت حاصل تھی۔



مدینۃ الاولیاء بہار شریف گویا کہ اسرار الٰہی کے محرم اولیاء اور پاسبان شریعت علماء کا مسکن ہے۔ جتنے علماء عظام و اولیاء کرام بہار شریف کی دھرتی پہ آرام فرما ہیں صوبہ بہار کے کسی خطے میں نہیں۔ فقیہ اعظم مولانا محب اللہ بہاری علیہ الرحمہ جن کا فتاویٰ عالمگیری میں خاص حصہ ہے اور جن علماء کرام کے زیر نگرانی فقہ حنفی پر تحقیقی کام ہوا تھا۔ ان میں علامہ محب اللہ بہاری بھی ہیں جو بہار شریف میں پیدا ہوئے اور بہار شریف ہی میں وصال فرمائے۔ آپ کا مزار پاک حضرت نور قطب عالم پنڈوی کے داماد اور خلیفہ اور حضرت نظام الدین اولیاء کے بھائی کے پوتے حضرت فرید الدین طبلہ بخش کے مزار کے قریب محلہ چاندپورہ میں مرجع خلائق ہے۔ غرض کہ بہار شریف میں ایک سے ایک نامور ہستی اور صاحب کشف بزرگ تشریف فرما ہے لیکن سرزمین بہار شریف کو سب سے زیادہ شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مخدوم جہاں مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ، ان کی اولاد اور خلفاء کی ذات اقدس سے ہی جلا ملی اور شہرت و عظمت حاصل ہوئی۔ ان کے خاندان اور سلسلۂ فردوسیہ میں ایک سے ایک صاحب علم و فن اور صوفی باصفا ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں حضرت مولانا سید شاہ امین احمد ثبات فردوسی سجادہ نشین خانقاہ معظم بہار شریف کی ذات گرامی

ایک عظیم اہمیت کی حامل
تھی۔ آپ صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ آپ کی تصنیفات آج بھی خانقاہ معظم بہار شریف میں موجود و محفوظ ہے۔

آپ کی شان اقدس میں اعلیٰ حضرت مجدد دین و ملت امام اہل سنت مولینا احمد رضا خاں فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک قصیدہ لکھا تھا جو اہل خانقاہ بہار شریف کے پاس محفوظ ہے۔

پٹنہ میں سنہ ۱۳ھ صدی ہجری میں ندوۃ العلماء کی جانب سے ایک جلسہ منعقد کیا گیا تھا لیکن اس میں بدمذہبوں کی شمولیت کی بنا پر علمائے اہل سنت نے مخالفت کی تھی اور جلسہ کا بائیکاٹ کیا تھا اور مفاسد ندوہ کے خلاف آپ ہی کے چہیتے مرید حضرت مولانا عبد الوحید عظیم آبادی فردوسی نے پٹنہ میں ۱۳۱۸ھ صدی ہجری میں ایک عظیم الشان جلسہ آپ ہی کی صدارت میں منعقد کیا تھا جس میں پانچ سو مشاہیر علمائے اہل سنت شریک ہوئے تھے۔ ان شرکاء میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی، بحر العلوم حضرت علامہ ہدایت اللہ رامپوری (استاذ صدر الشریعہ) مولینا امجد علی و سید سلیمان اشرف (بہاری) علامہ عبد الکافی الہ آبادی، علامہ سید فاخر الہ آبادی، علامہ معوان حسین فرزند و جانشین حضرت سید شاہ عبد الصمد پھپھوندوی (صدر مجلس علمائے اہل سنت) حضرت مولانا عبد المقتدر بدایونی، حضرت مولانا سید شاہ ہود الحق اسحق چشتی اور حضرت مولانا محب احمد بدایونی کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

جلسے میں متفقہ طور پر ندوہ کے مفاسد کا اعلان اس کا رد اور اس کے مقابل اہل سنت و جماعت کی ایک تنظیم کے قیام کا اعلان کیا گیا۔

مدینۃ الاولیاء بہار شریف بے شمار اولیائے کرام و مشائخ عظام اور پاسبان شریعت علماء و فضلا کا مسکن ہے جتنے اولیائے کرام و علمائے عظام بہار شریف کی دھرتی پر آرام فرما

ہیں صوبہ بہار کے کسی خطے میں نہیں۔

علامہ سید سلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ کو بھی اس مقدس سرزمین پہ پیدا ہونے کا شرف حاصل ہے۔

سید سلیمان اشرف بہاری رحمۃ اللہ علیہ

اشرف العلماء حضرت علامہ سید سلیمان اشرف بہاری ایک ممتاز سادات خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد گرامی کا نام حکیم سید محمد عبید اللہ اصدقی تھا۔ جو ایک درویش صفت بزرگ تھے۔ ریاضت و مجاہدہ اور زہد و قناعت کے پیکر تھے۔ اپنی ساری عمر فقر و درویشی میں گزاری۔

جائے پیدائش

مولانا سید سلیمان اشرف بہاری محلہ میرداد بہار شریف ضلع نالندہ میں ۱۸۷۸ء کے قریب پیدا ہوئے[1]

تعلیم و تربیت

چوں کہ بچپن ہی میں آپ (سید سلیمان اشرف بہاری) کے سر سے والد ماجد کا سایہ اٹھ گیا۔ اس لیے آپ مکمل طور سے والدہ ماجدہ کے زیر تربیت رہے ــــ آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کی پرورش و پرداخت کے ساتھ ساتھ بہتر تربیت فرمائی اور اعلیٰ تعلیم کی رغبت دلا کر ایک مشفقہ ماں کا ثبوت پیش کیا۔

تعلیمی سفر

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے مادر وطن بہار شریف میں مولوی رمضان علی[2] سے حاصل کی۔ اس کے بعد بہار اسکول میں داخلہ لیا۔

---

[1] علیم آباد کی تہذیبی داستان۔

یہاں آپ دسویں جماعت میں تھے کہ اچانک دل اچاٹ ہوگیا اور عربی تعلیم کی طرف طبیعت مائل ہوگئی۔ لہٰذا والدہ ماجدہ سے رضامندی حاصل کرکے آپ نے حضرت مولینا نور محمد اصدقی سے باضابطہ عربی اور فارسی میں درس لینا شروع کیا ——— دورانِ تعلیم ہی آپ نے اپنے مشفق استاد (مولانا نور محمد اصدقی رحمۃ اللہ علیہ) سے شرفِ بیعت بھی حاصل کرلیا اس طرح آپ سلسلہ چشتیہ نظامیہ اصدقیہ سے وابستہ ہوگئے۔ اور علوم ظاہری و باطنی کے حصول میں بیک وقت مشغول ہوکر اپنے پیر و مرشد سے علم سینہ و سفینہ حاصل کیا۔

جب پیر و مرشد کا وصال ہوگیا تو آپ بہت زیادہ مغموم ہوئے لیکن حصول تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں کیا اور مولانا ابُوالحسن استھانوی کی خدمت میں رجوع فرماکر حصولِ تعلیم میں منہمک رہے۔ پھر بھی آپ کو سیرابی نہیں ہوئی تو کانپور کا سفر کیا اور باضابطہ مولانا احمد حسین کانپوری کے مدرسے میں درس لینے لگے۔ وہاں مختلف کتابوں کے درس لینے کے بعد آپ نے ندوۃ العلماء میں داخلہ لے لیا۔ لیکن وہاں کے ماحول میں آپ کی طبیعت نہیں لگی۔ لہٰذا تھوڑے ہی دنوں کے بعد مدرسہ حنفیہ جون پور تشریف لے گئے۔ وہاں بحر العلوم مولانا ہدایت اللہ خاں فاضل رام پوری کی مکمل شاگردی اختیار کرلی اور تفسیر، حدیث، فقہ، منطق و فلسفہ کی سند سے سرفراز ہوئے ——— بعد فراغت اُستاذ محترم کے پاس جون پور میں مقیم رہے۔ اور جب ان کا وصال ہوگیا تو آپ نے جون پور کو چھوڑ دیا۔

اساتذہ سے محبّت

آپ کو اپنے تمام اساتذۂ کرام سے حد درجہ کی محبّت اور عقیدت تھی۔ اس لیئے جب بھی آپ اپنے کسی استاذ کا ذکر فرماتے تو آپ پر کیف کا عالم پیدا ہوجاتا۔ آپ اپنے اساتذہ کے ساتھ ساتھ ان سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے بھی اپنے دل میں کشادہ جگہ رکھتے ——— جیسا کہ آپ کے اُستاذ اور پیر و مرشد مولانا نور محمد اصدقی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر زادہ جب علیگڈھ تشریف

لے گئے تو آپ سے ملنے آپ کے قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ دروازے پر پہونچ کر دستک دی اندر سے اگر کسی نے جواب دیا کہ مولانا ابھی بہت مصروف ہیں کبھی اور وقت تشریف لایئے ——— انہوں نے کہا جاؤ میرا نام بتاؤ اور کہو میں بہار سے آیا ہوں۔ مولانا کو جب معلوم ہوا تو بہ نفس نفیس تشریف لائے، فرط محبت سے سلام و دست بوسی کی اور اپنے حجرے میں ساتھ لیتے گئے۔ خوب خاطر و مدارات کیئے اور انتہائی تعظیم و تکریم کے ساتھ رخصت فرمایا۔

ایسے ہی جب آپ کے اُستاذ گرامی بحر العلوم حضرت علامہ مولانا ہدایت اللہ خان جونپوری علیہ الرحمہ کا وصال ہو گیا تو آپ غم و آلام کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئے دل بالکل ہی ٹوٹ کر رہ گیا۔ ہر وقت بجھے بجھے سے رہنے لگے آخر کار جب اُستاذ موصوف کے شہر میں رہ کر ان کا صدمہ دل سے نکالنا ممکن نہ ہوا تو آپ بہار چلے آئے۔ آپ کی اساتذہ سے عقیدت کا تذکرہ سید سلیمان ندوی نے اس طرح کیا ہے:-

> "مولانا سید سلیمان اشرف بہاری صاحب کو حقیقت یہ ہے کہ اپنے اُستاذ کے ساتھ عقیدت ہی نہیں عشق تھا۔ اُن کے حالات جب سناتے تو اُن کے طرز بیان اور گفتار کی ہر ادا سے ان کی والہانہ عقیدت تراوش کرتی تھی[1]۔"

امام اہل سنت سے عقیدت آپ کو اساتذہ کے علاوہ جس دوسری عظیم شخصیت سے گہری عقیدت تھی۔ وہ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کی ذات گرامی ہے۔ آپ کو امام موصوف علیہ الرحمہ سے بے انتہا عقیدت و محبت تھی جس کا تذکرہ آپ کے شاگرد

---

[1] سید سلیمان ندوی معارف اعظم گڑھ ۱۳۴۹ھ

رشید ڈاکٹر سید عابد علی (سابق ڈائرکٹر بیت القرآن) نے اپنے ایک مضمون میں یوں کہا ہے:

"اُستاذ محترم سید سلیمان اشرف بہاری پر حضرت مولانا بریلوی کا اتنا تاثر تھا کہ میں نے مولانا احمد رضا خاں قدس سرہٗ کی عظیم شخصیت کا اندازہ دراصل اُستاذ محترم کی شخصیت ہی سے لگایا۔ مجھے مولانا سُلیمان اشرف سے شرف تلمذ کے علاوہ ان کا انتہائی قرب بھی رہا اور میں دیکھتا کہ اکثر مولینا بریلوی کا ذکر چھیڑ دیتے اور یوں محسوس ہوتا کہ اکثر ان ہی کے تصور میں مگن رہتے۔ حتیٰ کہ استاذ محترم کی طبیعت ان ہی کے رنگ میں رنگی گئی تھی اور اپنے معتقدات اور ایمانیات میں منطقی استدلال اور علوم عقلیہ میں خوش کلامی اور قوت بیان میں ہوبہو ان کے انداز اور کیفیات کو اپنا چکے تھے۔ غیر اسلامی شعار کی مذمت میں تشدد، کانگریسی اور ہندوؤں کی ہمنوائی کرنے والے لیڈروں اور عالموں کے متعلق سخت گیر رویہ مشرکین کو نجس سمجھنا اور ان کے معاملے کسی قسم کی مداہنت روا نہ رکھنا یہ سب صفات دونوں بزرگوں میں مشترک تھیں۔ اسی طرح عشق رسول کے معاملہ میں طبیعت کا ایک والہانہ انداز بھی سید صاحب میں حضرت فاضل بریلوی کی طرف آیا تھا۔ لباس اور وضع قطع میں بھی اُستاذ محترم حضرت مولانا فاضل بریلوی کا تتبع فرماتے۔ حتیٰ کہ مجھے یاد ہے کہ آپ عمامہ بھی اسی انداز کا رکھتے جیسا کہ حضرت مولانا (بریلوی) استعمال فرماتے تھے[1]۔"

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی علیہ الرحمہ سے جو آپ کو عشق تھا اور

---

[1] ڈاکٹر سید عابد علی: مقالات یوم رضا لاہور ۱۹۷۱ء ص ۱۰-۹

مسلک اہل سنت سے جو گہرا لگاؤ تھا اس کا تذکرہ سید سلیمان ندوی نے بھی کیا ہے:

"اُن کے مذہبی خیالات علمائے بریلی کے مطابق تھے اور اُن کے بڑے مداح تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنے مذہبی معتقدات میں بڑے متعصب تھے۔ اور جب مذہبی گفتگو ہوتی تو جلال میں آجاتے تھے[1]۔"

دیوانگیٔ عشق بڑی چیز ہے سیماب
یہ اُن کا کرم ہے جسے دیوانہ بنالیں

اس حقیقت کا اظہار سید سلیمان اشرف بہاری کی تصنیف "المبین" کے تعارف میں سید نور محمد قادری اس طرح کرتے ہیں:

"اُستاذ گرامی مولانا ہدایت اللہ خاں کی وفات کے بعد اعلیٰحضرت ہی کی ذات تھی جو آپ کا ملجا و ماویٰ تھا۔ اعلیٰ حضرت کی وفات تک مولانا کے نیازمندانہ تعلقات قائم رہے۔ جبکہ اعلیٰ حضرت کے مرض الموت کے دنوں میں آپ بریلی شریف میں ہی تھے اور اعلیٰ حضرت کی تجہیز و تکفین کا شرف بھی آپ کو نصیب ہوا۔"

اعلیٰحضرت فاضل بریلوی آپ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے ——— آپ بے حد متاثر تھے اور ایک مرتبہ اعلیٰحضرت فاضل بریلوی نے آپ کے متعلق فرمایا تھا کہ ——— "مولانا سید سلیمان اشرف بہاری جب مناظرہ میں تنقیحات قائم کرتے ہیں تو مخالفین کو شکست ہو جاتی ہے[2]۔"

---

[1] سید سلیمان ندوی، شذرات معارف اعظم گڑھ ۱۹۳۱ء ص [illegible]

[2] ڈاکٹر ضیاء الدین [illegible]

[illegible] تذکرہ مولانا سید سلیمان اشرف بہاری [illegible] اور اس کی تحقیق کے لیے یورپ جانا چاہتے تھے [illegible] مولانا کے ہمراہ بریلی شریف اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے اس [illegible] زندگی بھر کے لیے اعلیٰ حضرت کی قابلیت کے قائل ہو گئے۔

حلیہ مبارک آپ وجیہ شکل و صورت کے مالک تھے۔ آپ کی صباحت و حلیہ مبارک کا تذکرہ اردو کے مشہور و معروف نقاد و ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنی تصنیف "گنجہائے گرانمایہ" میں یوں کرتے ہیں:

"قد میانہ، رنگ صاف، جلد روشن، اعضا پتلے، نقشہ نرم و نازک، آنکھیں چھوٹی جس میں جذبات کا اتار چڑھاؤ جھلکتا رہتا ہے۔۔۔ نظر تیز و پر اعتماد، انداز میں بانکپن، انگلیاں ایسی جن میں قلم شمشیر و رباب سب ہی زیب دیں۔"[۱]

خواجہ حسن نظامی اس طرح لکھتے ہیں کہ:

"گورا رنگ، مضبوط جسم، گنجان داڑھی، تیز اور چمکدار آنکھیں۔"[۲]

عادت شریفہ کسی شخص کی شرافت و طبیعت اور مزاج کا اندازہ اس کے روزمرہ کے حالات و کوائف سے لگایا جاتا ہے۔ لہٰذا جب آپ کے حالات و کوائف اور روزمرہ کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مولانا سید سلیمان اشرف بہاری ایک شریف طبیعت کے مالک تھے اور شرفاء کے جو اوصاف ہوتے ہیں وہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔

آپ کے شاگرد پروفیسر رشید احمد صدیقی جن کو آپ کے ساتھ علی گڑھ میں رہنے اور کام کرنے کا شرف حاصل تھا اور پروفیسر موصوف نے آپ کی زندگی کو بہت ہی قریب سے دیکھا اور مولانا کے آخر وقت تک ان سے اچھے اور مضبوط مراسم بھی رہے۔ انھوں نے مولانا کے علی گڑھ میں قیام کے حالات و کوائف اور آپ کے عادات و معمولات کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

"مرحوم کی زندگی کا ایک پہلو یہ تھا کہ جو چیز رکھتے تھے اس میں کوئی نہ کوئی

---

[۱] گنجہائے گرانمایہ صفحہ ۳۷، ۳۶۔ [۲] کتابی دنیا جنوری۔فروری ۱۹۶۰ء

خاص بات ضرور ہوتی اور دلکش ہوتی، قیمتی ہوتی۔ ہمیشہ پاکیزہ، قیمتی اور مردانہ وضع کے لباس پہنتے، گراں قیمت اور نادر قسم کے اونی کپڑوں کا بہت شوق تھا۔ شیروانی یا اونی رُوئی دار اچکن کا کپڑا دلکش ہوتا مرحوم کے معمولات بھی غیر معمولی تھے۔

سردیوں میں باہر سوتے تھے۔ ابتدا تو بالکل صحن میں لیکن ادھر چند سال سے برآمدہ میں آرام کرنے لگے تھے۔ گرمیوں میں اندر رضائی اوڑھ کر بستر گداز، چادریں سُتھری، تکیے متعدد، پنکھے کا کوئی دستور نہ تھا۔ گرمی میں نہ برف کا پانی مل سکتا تھا نہ سردی میں گرم پانی کہ پسینہ آنا بہت اچھا ہے۔ شام کا نہانا اور دھوپ میں بیٹھنا منع کرتے تھے، دوسرے کے تولئے یا رومال سے ہاتھ نہیں پونچھتے تھے، ننگے سر بمشکل دیکھے گئے، گفتگو بلند آواز سے کرتے، کالا چوری گوارا نہ تھی، عمامہ اکثر ہلکے زعفرانی رنگ کا ہوتا، جو تی دلی کے پر زردار، ململ کا لمبا بڑی کشادہ آستینوں کا کُرتا پہنتے۔ جس کے نیچے ہمیشہ ململ کی بٹن دار صدری ہوتی، کپڑا قیمتی اور شریفانہ رنگ اور وضع کا ہوتا، اچھا کپڑا پہنے دیکھتے تو خوش ہوتے اور تعریف کرتے، ناپسند ہوتا تو کہہ دیتے، سالن تیز مرچوں کا پسند تھا، ہمیشہ چٹائی پر اکڑوں بیٹھ کر کھاتے۔ نوکروں کا بڑا پاس رکھتے۔ لکھنے میں سطر کبھی سیدھی نہیں ہوتی تھی۔ جسے دوست رکھتے اس سے نہایت خوش ہو کر آگے بڑھ کر جی کھول کر ملتے اور کوئی نہ کوئی خوش دلی کا فقرہ ضرور کہتے۔ مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے، کسی کے علم سے، نہ کسی کی دولت سے، نہ کسی کے اقتدار سے، مذہبی عقائد میں کٹر، سلوک میں بے لوث، جو

جتنا چھوٹا ہوتا اس سے اتنی ہی فروتنی سے ملتے، بڑا ہوتا اس سے کہیں بڑا ہو کر ملتے، علم کا وقار ان کے دم سے تھا، معزز و محبوب مولوی میں نے انہی کو پایا۔"[۱]

سید سلیمان ندوی یوں رقمطراز ہیں:

"مرحوم خوش اندام، خوش لباس، خوش طبع، نفاست پسند، سادہ مزاج اور بے تکلف تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی اُن کی خودداری اور اپنی عزتِ نفس کا پاس تھا۔

مسلم یونیورسٹی میں آپ کا تقرر

مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی علیگڈھ سے مولانا سید ضمیر الدین بہاری سے ملنے پٹنہ تشریف لائے۔ اتفاق سے اسی درمیان مولانا سید سُلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ بھی مولانا سید ضمیر الدین سے ملاقات کی غرض سے تشریف لے آئے اور وہیں آپ کی ملاقات مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی سے ہوئی ——— مولانا حبیبُ الرحمٰن شیروانی نے پہلی ہی ملاقات میں آپ کے علم و فضل کو بھانپ لیا اور آپ کے اندر چھپے جوہر کا سراغ لگا لیا ——— لہٰذا مولانا شیروانی نے آپ کو علی گڈھ چلنے کو کہا[۲]۔ آپ راضی ہو گئے اور علی گڈھ تشریف لے گئے وہاں پہونچے ہی تھے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ۱۹۱۵ء شعبۂ دینیات کے لئے ایک لکچرر کی ضرورت پیش آئی آپ کو اطلاع ملی تو اپنے آپ کو

۱؎ گنجہائے گرانمایہ ص۳۵ تا ۳۶ سید سلیمان ندوی، معارف اعظم گڈھ جون ۱۹۳۹ء

۲؎ عظیم آباد کی تہذیبی داستان ص۳۰۲

آپ نے بحیثیت امیدوار پیش کیا۔ آپ سے انٹرویو میں معجزہ پر مقالہ لکھنے کی فرمائش کی گئی اور کہا گیا کہ اگر کتابوں کی ضرورت ہو تو حبیب گنج تشریف لے جائیں ـــــ آپ نے فرمایا بحمد اللہ مجھے کتابوں کی ضرورت نہیں صرف کاغذ اور قلم دیا جائے۔ لہٰذا آپ بعد نماز عشاء کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گئے اور صبح کی نماز تک ایک ہی مجلس میں معجزہ پر ایک مدلل و مفصل مضمون (جو ۲۲ فل سکیپ صفحات پر محیط تھا) قلمبند کر دیا جسے ارباب علم و فن نے بہت پسند کیا ـــــ پھر نماز جمعہ کے بعد توحید پر خطاب کرنے کے لیے کہا گیا۔ آپ نے اس موضوع پر بہت ہی پر مغز تقریر فرمائی۔ جسے سُن کر سامعین مست ہو گئے ـــــ سُننے والوں میں نواب وقار الملک مشتاق حسین اور مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے ساتھ ساتھ تمام اراکین دینیات کمیٹی موجود تھے ـــــ آپ کی علمی لیاقت کو دیکھ کر اور پر مغز تقریر سماعت فرما کر یہ لوگ بیحد متاثر ہوئے اور شعبۂ دینیات میں پچاس روپے مشاہرہ پر آپ کا تقرر کر لیا۔

مولانا سید سُلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ نے درس و تدریس کے فرائض بہت ہی خوش اسلوبی اور مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دیئے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی مسلم یونیورسٹی کے لئے ہی وقف کر دی۔ اس درمیان یونیورسٹی کے اندر نہ جانے حالات نے کتنے ہچکولے کھائے، آپ کے خلاف سازشیں کی گئیں۔ رکیک حملے کئے گئے، اخبارات میں ناروا جملے آپ کے لئے لکھے گئے، بہتان تراشی کی گئی، قدامت پرستی کے طعنے دیئے گئے اور تہمتوں کا طوفان برپا کیا گیا لیکن آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائی بلکہ آپ نے تنہا ان حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور کسی بھی ہنگامے کی طرف بغیر توجہ کئے اپنے کام میں لگے رہے۔

آپ کے عزم و استقلال کا تذکرہ پروفیسر رشید احمد صدیقی یوں کرتے ہیں:

آج کم و بیش دس گیارہ سال ہوئے یونیورسٹی پر تحقیقاتی کمیٹی بیٹھ چکی تھی،

بعض دوسرے لوگوں کی طرح مولانا خاص طور پر زد میں تھے، ہر طرف سراسیمگی چھائی ہوئی تھی، نفسی نفسی کا عالم تھا بڑے بڑے سرماؤں کے پاؤں لڑکھڑانے لگے تھے۔ اس وقت کا حال کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جن پر وہ عالم گذر چکا ہے۔ اس زمانہ میں مولانا کو دیکھا کیا مجال کہ روزمرہ کے معمولات میں فرق آجاتا۔ جن کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے اس کا علی الاعلان اظہار کرتے، شام کے وقت برآمدہ میں لوگ بیٹھے ہوتے چائے نوشی کی صحبت گرم ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے مصیبت کا کہیں نام ونشان نہیں۔ کسی کی مجال تک نہیں ہوتی کہ آنے والی آفت کا تذکرہ کرتا۔ ایک شب میں حاضر ہوا، مرحوم (سید سلیمان اشرف بہاری) کی خدمت میں اکثر ایسی باتیں بھی کہہ جاتا جو دوسرے کے کہنے میں ہمیشہ تامل کرتے، عرض کیا مولانا کیا ہونے والا ہے۔ خدانخواستہ نوع دیگر ہوا تو کیا ہوگا۔ کہنے لگے رشید! تم بھی ایسا کہتے ہو، مجھے خیال تھا تم اس قسم کا ذکر نہ چھیڑو گے۔ ہوگا کیا وہی ہوگا جو ازل سے تقدیر ہو چکا ہے۔ مومن کی شان یہی ہے کہ اس پر ہراس طاری نہ ہو۔ تم ڈر گئے تو ان لوگوں کا کیا ہوگا جو تم کو اپنا سردار سمجھتے ہیں۔ جو ہونے والا ہے وہ تو ہو چکا ہے۔ پھر ڈرنے جھجکنے سے کیا فائدہ؟

مرحوم پر اس وقت جلال سا طاری تھا۔ شہنشاہیت روما کا وہ عہد یاد آگیا جب گاگس نے روم پر قبضہ کیا اور وحشیوں نے فتح کے نشہ میں گریسینٹ کا رخ کیا جہاں کا ہر رکن اپنی اپنی جگہ متانت اور وقار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جن میں سے ہر ایک کو وحشیوں نے نشست ہی پر ذبح کر دیا لیکن کسی سینیٹر نے اپنی جگہ چھوڑی اور نہ آہ وزاری کی۔

وہ دن گذر گئے، جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہو چکا، مرحوم بھی جوار رحمت میں پہونچ گئے۔ آج اس زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کیسا مرد اور کتنا بڑا

سردار بم سے چھین لیا گیا۔ مرحوم میں سرداری کی بڑی بڑی باتیں تھیں۔ تحقیقاتی کمیٹی کا زمانہ کوئی معمولی زمانہ نہ تھا۔ اس وقت صرف مرحوم کی ذات ایسی تھی جو اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح قائم تھی۔ مجھے یقین ہے کہ مرحوم زندہ ہوتے اور اُن کے تاریکی دو منزلہ پر دشمن کے ہوائی جہاز بم برساتے ہوتے تو بھی ان کے معمولات میں کوئی فرق نہ آتا۔۱

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی!
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مولانا موصوف پچاس برس تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منصب درس و تدریس پر فائز رہے، آپ سے بے شمار افراد نے استفادہ کیا۔ آپ کی قیام گاہ پر صاحب علم و فن کا جمگھٹا رہتا اور آپ کی علمی گفتگو سے ہر آنے والا مستفیض ہوتا۔ رشید احمد صدیقی آپ کی علمی محفل کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں:۔

"کرسی ہو، مونڈھا ہو، صوفہ ہو، تخت ہو بیٹھتے ایک ہی وضع سے تھے۔ پاؤں اُٹھا کر اور سمیٹ کر، اسی طرح بیٹھ کر چائے پیتے، مطالعہ کرتے، لکھتے اور باتیں کرتے نشست کا ہر طرح کا سامان ہوتا۔ چبوترے سے متصل نیم دائرہ سائبان میں مونڈھے بچھے ہوتے، ایک طرف چارپائی بھی ہوتی بڑے سے بڑا آدمی بھی کیوں نہ آجاتا اس کے لئے کوئی اچھی کرسی یا صوفا وغیرہ اندر سے نہ نکالا جاتا۔ جو موجود ہوتا اسی پر وہ بیٹھ جاتا۔ مجمع دیکھ کر یہی معلوم ہوتا کہ مرحوم ہی سب پر چھائے ہوئے ہیں۔ کسی سے مرحوم نے آج تک ایسی گفتگو نہ کی جس سے معلوم ہوتا کہ نو وارد سے مرعوب ہیں یا اس سے خاص طور پر مخاطب ہیں۔ بڑے سے بڑے نواب کو بھی میں نے مرحوم کے پاس بیٹھے دیکھا ہے اور لوگ بھی موجود ہیں لیکن مولانا ہر ایک سے ایک ہی اُتار چڑھاؤ

ا۔ گنجہائے گرانمایہ ص ۲۹-۲۷

سے گفتگو کر رہے ہیں۔ مولانا کا پرانا نوکر جمّا اسی طرح نواب صاحب کو چائے کی ایک پیالی لا کر دے گا جس طرح وہ مجمع میں کسی اور کو دیتا۔ وہی بے ضبطہ زبان گفتگو، وہی نشست، وہی فضا جس کا جی چاہا اُٹھ کر چلا گیا۔ اسی دوران میں معزز نووارد بھی تشریف لے گئے۔ مرحوم اپنی جگہ پر جوں کہ توں باغ و بہار یا کوہ وقار بنے بیٹھے رہے[1]۔

مولانا کے مزاج کو بے ضابطگی ہرگز پسند نہ تھی آپ نے ہر کام کے لئے اصول و ضابطے بنا رکھے تھے اور اس پر سختی سے کاربند رہتے۔ آپ نے اپنی علمی مجالس کے انعقاد کے بھی اُصول مرتب کئے جن پر شرکاء مجلس سختی سے عمل کرتے۔

ان اُصولوں کا تذکرہ مولانا مقتدی خاں شیروانی نے یوں کیا ہے :-

(۱) کسی کی بدخوئی نہ ہوتی تھی۔
(۲) کوئی خود غرضی کا معاملہ نہ ہوتا تھا۔
(۳) ہر قسم کے مضامین پر ایسے انداز میں بات ہوتی تھی کہ دماغ پر مطلق بار نہ ہو۔
(۴) قابل ہمدردی لوگوں کی مدد پر غور ہوتا تھا۔
(۵) دوسروں کی اخلاقی اقدار کو سراہا جاتا وغیرہ وغیرہ"[2]

رشید احمد صدیقی نے آپ کی فیضان صحبت کا ذکر اس طرح کیا ہے :-

مولانا کی صحبت سے جب کبھی اٹھتا تو معلوم ہوتا کہ کوئی اور اچھی بات سیکھی یا کوئی نیا حوصلہ اور اچھا جذبہ پیدا ہو گیا۔ پریشان و مایوس ہوا تو ان کے یہاں سے بشاش اٹھا، رنج یا غصہ ہوا تو مرحوم کی باتوں سے غم غلط ہو گیا۔ خالی الذہن گیا

---

[1] گنجہائے گرانمایہ ص ۲۵-۲۶

[2] محمد مقتدی خاں شیروانی، قومی زبان کراچی اگست ۱۹۶۳ء

تھا تو معلومات کے ایسے نادر و لطیف نکتوں سے بہرہ مند اُٹھا جو شاید مدتوں کے
مطالعے یا مشاہدہ سے حاصل نہ ہو سکے۔" گنجہائے گرانمایہ صـ۲۶

رشید صاحب اسی خیال کو دوسری جگہ یوں بیان کرتے ہیں :-

"مرحوم ایسوں سے کبھی علمی گفتگو نہ کرتے جن کے بارے میں ان کو یقین ہوتا
کہ اس کو علم کا گھمنڈ ہے یا علم کی گہرائی یا درازی نصیب نہیں ہے۔ یا صرف دنیوی اعزاز
کا حامل ہے۔ اگر کوئی چھیڑ بھی دیتا تو ٹال جاتے ورنہ صاف کہہ جاتے کوئی دوسری
بات کیجئے آپ کو ان باتوں سے کیا سروکار" صفحہ ۳۷

مولانا کا اگرچہ علی گڑھ یونی ورسٹی میں شعبہ دینیات کے مدرس کی حیثیت
سے تقرر ہوا تھا مگر تھوڑے ہی دنوں میں پورے یونیورسٹی پہ چھا گئے۔ آپ اپنی
خودداری طبیعت کی بنا پر سب سے الگ رہتے لیکن لوگ آپ کو اپنے سے الگ نہیں
سمجھتے، آپ کسی کے یہاں نہیں جاتے مگر آپ کے یہاں علماء و فضلاء، ادباء، سیاسی
رہنمایان، اعلیٰ حکام اور دیگر ہر طبقہ کے لوگوں کا تانتا لگا رہتا اور آپ ہر آنے والے
کے ساتھ بڑے اخلاق سے ملتے اور سب کے ساتھ بلا امتیاز ایک جیسا سلوک کرتے۔"

سید سلیمان ندوی نے آپ کی محفل کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :

"اُن کی قیام گاہ ایک درویش کی خانقاہ تھی جو آتا جھک کر آتا۔ اگر مجلس
ساز گار ہوئی تو دعائیں لے کر گیا ورنہ الٹے پاؤں ایسا واپس آیا کہ پھر اُدھر کا رخ نہ کیا[1]
مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی آپ کی قیام گاہ کے مستقل حاضر باشوں
میں تھے۔ سید بدرالدین علوی (سابق پروفیسر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) نے جس کا
تذکرہ اپنے مضمون میں کیا ہے :-

"نواب صدر یار جنگ مرحوم کی عادت تھی کہ جتنے دن بھی علی گڑھ قیام
رہتا روزانہ مغرب کے قریب مولوی سلیمان اشرف کے یہاں تشریف لاتے۔ علی

[1] المعارف اعظم گڑھ جون ۱۹۳۹ء

و دینی مسائل، بزرگوں کے تذکرے اور تاریخی واقعات موضوع سخن رہتے تھے[1]"

سید سلیمان ندوی نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے :-

"مرحوم (شیروانی صاحب) کی پابندیٔ وضع کی ایک خاص یادگار علیگڑھ میں مولانا سلیمان اشرف صاحب کی قیام گاہ میں اخیر وقت کی حاضری تھی جو مغرب تک جاری رہتی۔ جب وہ علیگڑھ آتے، یہ حاضری بلا ناغہ ہر موسم میں اور ہمیشہ رہی اس وقت دلچسپی کا سامان علمی مسائل پر گفتگو رہتی۔ مولانا سید سلیمان اشرف کی وفات کے بعد مولانا عبداللطیف کی قیام گاہ پر اسی حیثیت سے یہ مجلس جاری رہی[2]۔

مولانا سید سلیمان اشرف بہاری گرچہ اپنے معتقدات میں پکے تھے، مسلک اہل سُنّت کا آپ پہ نمایاں اور گہرا رنگ تھا پھر بلا جھجک اس کا اعلان بھی کرتے لیکن اسکے باوجود آپ کی محفل میں ہر مکتب فکر اور مختلف نظریات کے حامل افراد آتے، مختلف عناوین و مسائل پر گفتگو اور بحثیں ہوتیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں :-

"مرحوم مذہبی معتقدات میں بڑا غلو رکھتے تھے اور اظہار کا موقع آتا تو کھلم کھلا ان کا اعلان بھی کر دیا کرتے۔ بایں ہمہ مختلف الخیال لوگوں سے بقول انکے کھانا کھلا ہوا تھا۔ خانقاہ سُلیمانیہ کے مقربین میں محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مولانا ابوبکر صاحب، محمد مقتدی خاں شیروانی، نواب صدر یار جنگ بہادر، سید زین الدین صاحب تھے۔ باہر والوں میں سے مولوی ابوالحسن صاحب، سید بہاؤ الدین صاحب کو یہ امتیاز حاصل تھا[3]۔"

---

[1] سید بدرالدین علوی معارف اعظم گڑھ جون ۱۹۵۰ء

[2] سید سلیمان ندوی " دسمبر ۱۹۵۰ء

[3] گنجہائے گرانمایہ۔ صفحہ ۵۴

آپ نے علی گڈھ پہونچتے ہی تعلیم و تلقین اور رشد و ہدایت کی غرض سے ہر روز عصر کی نماز کے بعد درس قرآن دینے کا سلسلہ شروع کیا جو بعد میں آپ کا مستقل معمول بن گیا۔ اس مجلس درس قرآن کا تذکرہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی نے اپنے ایک مضمون میں یوں کیا ہے :-

"نواب وقار الملک کے زمانہ میں علی گڈھ کالج میں پروفیسر دینیات کا عہدہ قائم ہوا تو سید سلیمان اشرف کا تقرر بطور پروفیسر دینیات عمل میں آیا۔ درس قرآن و تفسیر کی جماعت قائم ہوئی۔ اس کا ایک دور ختم ہوگیا تھا۔ اس وقت بھی علمائے کرام مدعو ہوئے تھے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی، مولانا ولایت حسین صاحب الہ آبادی اور مولانا عبدالحق صاحب حقانی اور بزرگوں سے درخواست قدوم کی گئی تھی، چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی تشریف لائے۔ چند گھنٹے امتحان لیا جو تحریر بعد امتحان میرے نام بھیجی تھی اس سے واضح ہوتا تھا کہ نتیجہ امتحان سے ممدوح کو حیرت انگیز اطمینان ہوا تھا۔ (مقالات شیروانی علیگڈھ ۱۹۳۶ء)

درس قرآن سے مستفیض ہونے والوں میں چند نام اس طرح ہیں :-

مولانا فضل الرحمٰن انصاری، پروفیسر رشید احمد صدیقی، قاری محمد انوار صمدانی، ڈاکٹر سید عابد احمد علی اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی وغیرہم۔

طوفان کر رہا تھا مرے عزم کا طواف
دُنیا سمجھ رہی تھی کہ کشتی بھنور میں ہے

خودداری طبیعت اور عزم و استقلال

آپ ایک نڈر اور بہادر مرد مجاہد و عزم و استقلال کے پیکر تھے۔ بڑے سے بڑے طوفان حوادث میں بھی آپ کے پائے استقلال میں لرزش پیدا نہیں

ہوتی۔ قوت فیصلہ کے دھنی تھے جو کہہ دیتے اس پہ قائم رہتے۔ خوشامد پرستی آپ کو بالکل پسند نہ تھی۔ اور نہ ہی نامعقول لوگوں کو کبھی اپنے سے قریب کیا، نہ کسی دُنیادار، ملت فروش سیاسی افراد کی بے جا حوصلہ افزائی کی ـــــ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کیجانب ہمیشہ اہل سیاست کی نظر رہی اور سیاسی بازی گروں کا ہمیشہ نزول ہوتا رہا۔ ان کے اعزاز میں ان کے خوشامدین جلسے منعقد کرتے لیکن آپ نے کبھی بھی کسی سیاسی شخص کی آمد پر منعقدہ جلسے میں شرکت نہیں فرمائی۔

ایک دفعہ اجمیر شریف حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمہ کے آستانے پر حاضری کی غرض سے تشریف لے جا رہے تھے۔ آپ جس ٹرین سے سفر کرنے والے تھے اسی ٹرین سے ایک ذی وجاہت شخص کی آمد تھی یونیورسٹی کی طرف سے ان کو استقبالیہ دیا جاتا تھا۔ متعلقین یونیورسٹی اسٹیشن پر حاضر تھے، گاڑی آئی اتفاق سے وہ ذی وجاہت شخص اسی ڈبے سے نکلے جس میں مولانا سید سلیمان اشرف بہاری سوار ہو رہے تھے۔ آنے والے شخص نے سمجھا کہ مولانا سید سلیمان اشرف بہاری میرے استقبال کے لئے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے خوش ہو کر گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن مولانا نے بلا کسی پس و پیش کے فرمایا " جی اس سعادت کے لئے دوسرے لوگ آئے ہوئے ہیں میں ہاتھ نہیں ملاتا۔ یہ کہہ کر اپنے ڈبہ میں سوار ہو گئے ـــــ آپ کی خودداری طبیعت کے متعلق سید سلیمان ندوی یوں رقم طراز ہیں:-

" ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی خودداری اور اپنی عزت نفس کا پاس تھا۔ ان کی ساری عمر علی گڈھ میں گذری۔ جہاں امرا اور ارباب جاہ کا تانتا لگا رہتا تھا۔ مگر انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ ان میں سے کسی سے دب کر یا جھک کر ملے جس سے ملے برابری سے ملے اور اپنے عالمانہ وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر۔

علی گڑھ کے سیاسی انقلابات کی آندھیاں بھی ان کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکیں[1]۔

آپ نے عدم تعاون کے رہنماؤں کے خلاف مسلسل جہاد کیا اور ان کی بے راہ روی سے لوگوں کو آشنا کرایا۔ حالانکہ مخالفوں کی طرف سے آپ کی ذاتیات پر گھناؤنے حملے کئے گئے۔ اخبارات و رسائل خرافات سے بھر دیئے گئے۔ جم کر تبرا بازی کی گئی لیکن ان سب کے باوجود آپ کے پائے استقلال میں ذرا بھی لرزش نہیں آئی بلکہ اپنی جگہ کوہ وقار بنے بیٹھے رہے اور اپنے مشن کو بحسن و خوبی چلاتے رہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیں:۔

"مرحوم کے خلاف اخباروں میں بڑے نامعقول مضامین نکلے اور اکثر ایسے ناروا اور رکیک حملے کئے گئے کہ انھیں یاد کرکے آج تک میرا دل کڑھتا ہے اور لکھنے والوں سے قلبی نفرت پیدا ہو گئی ہے لیکن مولانا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ آج تک میں نے ان کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا نہیں سنا جس سے اندازہ کیا جاسکتا کہ ان پر اس کا کوئی اثر ہے۔

ایک دن معلوم نہیں کون سا موقع تھا، اس اخباری گندگی کا تذکرہ آیا تو فرمایا اور مخصوص قلندرانہ انداز سے چلو آگے بڑھو یہ نہیں دیکھتے کون کہہ رہا ہے صاحبزادہ ہو یہی دیکھتے ہو کہ کس کے خلاف کہہ رہا ہے۔ لڑائی مجھے پسند ہے لیکن بہادروں سے بلبلوں سے نہیں[2]۔

مولانا اپنی خودداری طبیعت کی وجہ سے بہت ہی اصول پسند اور دشمنوں کیلئے شمشیر برہنہ تھے لیکن اپنوں کے لئے خلوص و محبت کے گنجہائے گرانمایہ رکھتے تھے۔ گویا آپ کی شخصیت اس شعر کی مصداق تھی ؎

---

[1] معارف اعظم گڑھ جون ۱۹۳۹ء

[2] گنجہائے گرانمایہ ص ۴۴

حلقۂ یاراں ہو تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!

خطابت آپ کو جہاں بہت سے دوسرے کمالات حاصل تھے وہیں فن تقریر میں بھی اچھی خاصی مہارت و کمال حاصل تھا۔ آپ کی خطابت میں رعب تھا، کیف و مستی کا سامان اور نصیحتوں کا بے بہا خزانہ بھی تھا۔ قادر الکلامی بھی تھی اور جادو بیانی بھی۔ آپ کی تقریر سننے کا شوق ہر دل میں جاگزیں تھا جو آپ کو جانتے تھے علماء، فضلاء اور وقت کے نامور مقررین کرام بھی آپ کی تقریر سننے کو بے قرار ہوتے اور تقریر سننے کے بعد عش عش کرنے پر مجبور رہتے۔ خواجہ حسن نظامی آپ کی خطابت کے متعلق یوں رقم طراز ہیں :-

"تقریر ایسی تیز اور مسلسل کرتے ہیں جیسے آئی آر کی ڈاک گاڑی دوران تقریر صرف درود شریف پڑھنے کے لئے تھوڑی تھوڑی دیر میں وقفہ ہوتا ہے ورنہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمالیہ کی چوٹی سے گنگا کی دھار نکلی ہے جو ہر دوار تک ہی رکنے اور ٹھہرنے کا نام لے گی۔ بیان کی ایسی روانی آج کل ہندستان کے کسی عالم میں نہیں دیکھی۔ تقریر میں محض الفاظ ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر فقرے میں دلیل اور علمیت کا اندازہ ہوتا ہے"[1]

سید سلیمان ندوی نے اس طرح لکھا ہے :-

ان کی تقریر و وعظ میں بڑی دلچسپی اور گرویدگی تھی[2]

سید بدر الدین بہاری نے آپ کی تقریر کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اور بہت ہی کامیاب معلومات فراہم کی ہیں ان کی تصنیف عظیم آباد کی "تہذیبی داستان"

---

[1] خواجہ حسن نظامی کتابی دنیا [2] المعارف اعظم گڈھ جون ۱۹۳۹ء

"حقیقت بھی کہانی بھی" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

"مولانا بڑے شیریں گفتار تھے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین یا کوئی معمولی موضوع گفتگو ہو سب پر بڑی شگفتگی کے ساتھ تقریر کرتے۔ ان کی گفتگو میں مزا بھی ہوتا، ادب کا لطف بھی آتا اور نئے نئے جملے اور محاورات ان کی گفتگو میں نگینہ بنکر چمکتے۔ علم خطابت میں ان کا درجہ ہندوستان کے بڑے بڑے مقررین کے مقابلے میں مانا ہوا تھا۔

تقریر ایسی والہانہ اور پُرکیف ہوتی تھیں کہ مجمع تو مجمع ماحول اور فضا پر بیخودی چھا جاتی تھی۔ جب مولانا کی شدت جذبات سے بھرائی ہوئی آواز در و دیوار سے ٹکراتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ در و دیوار سے صلوٰۃ کی صدائیں آرہی ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی آپکے خطبات کی روداد اس طرح بیان کرتے ہیں:-

"آواز میں کڑک، لچک اور دھمک، نماز پڑھاتے تو معلوم ہوتا کہ خدا کا کلام دوسروں کو پہونچانے میں اپنی اور اپنے مالک دونوں کی عظمت کا احساس ہے۔

جمعہ کی ایک نماز یاد ہے۔ جاڑے کے دن تھے یخ بھری ہوائیں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا رگ و ریشہ میں سوئیاں بن کر اترتی جاتی ہیں۔ ناظم صاحب دینیات غالباً موجود نہ تھے۔ مرحوم امامت کے لئے آگے بڑھے، تکبیر ختم نہیں ہوئی تھی کہ مولانا نے کہا "اللہ اکبر" ایسا معلوم ہوا جیسے اس صدا نے فضا کی ہر صدا کی لرزش چھین لی۔ اس کے بعد جو قرأت شروع کی تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلوار میدان جہاد میں کوندتی، لرزتی، گرتی، لپکتی، کاٹتی، سمٹتی، تیرتی، ابھرتی آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ کوئی لمبی سورہ تھی، جب تک ختم نہ ہوئی یہ معلوم ہوتا تھا جیسے جسم و جان میں بجلیاں بھر گئی ہیں اور شوق خود سپاری میں ہمیں نہیں در و دیوار بھی جھوم رہے ہیں۔ اس دن کی نماز اب بھی یاد ہے اور یہ بھی کہ وقت آگیا تو شوقِ شہادت دنیا کے

ہر نشیب و فراز زندگی کے ہر تامل و تذبذب کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔[1]

مولانا نے جہاں دوسروں سے اپنے فن کا لوہا منوایا اور داد و تحسین وصول کئے وہیں اپنے مشفق اُستاد حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں علیہ الرحمہ سے بھی اپنی فنکاری کا جوہر دکھاکر دعاؤں اور شفقتوں کا خزانہ لے لیا۔

اِس زمرے میں ایک واقعہ پیش کردوں کہ قیام جون پور کے دوران مولانا سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسے میں ایک بار خطاب فرما رہے تھے۔ مجمع سیلاب کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ آپ کی تقریر شباب پہ تھی، مجمع بھی جوانی کے عالم میں تقریر سماعت کر رہا تھا، وارفتگی اور محویت کی فضا قائم تھی۔ اسی اثنا میں آپ کے اُستاد محترم مولانا ہدایت اللہ خاں جون پوری علیہ الرحمہ کا گذر اس طرف سے ہوا۔ اپنے ہونہار اور کامیاب شاگرد کی گرجدار اور دل گداز آواز سُن کر ٹھہر گئے۔ تھوڑی دیر تقریر سُننے کے بعد جب قوت برداشت جواب دے گئی تو شفقتوں اور محبتوں کا طوفان بن کر مجمع کو چیرتے ہوئے آپ اپنے شاگرد رشید (مولانا سُلیمان اشرف) کے پاس پہونچ گئے اور فرط محبت سے گلے لگاکر پیشانی کو بوسہ دیا۔ سال ۱۹۲۱ء میں ترک موالات اور نان کوآپریشن کے ہنگامے اپنے شباب پر تھے۔ پورے ملک کے افراد اس سیلاب کے زیر اثر تھے۔ اسکی قیادت سیاسی جماعتوں کے آلہ کار افراد کر رہے تھے۔ خلافت کمیٹی اور جمعیتہ العلماء کے اشخاص بے راہ روی پہ اُتر چکے تھے، دنیا داری ان کے سینوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ غیر اسلامی نظریات و غیر شرعی حرکات کے محرک بنے ہوئے تھے۔ عدم تعاون کے عظیم طوفان میں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔ لیکن ایسے عالم میں مولانا سید سلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ نے ان حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور تن تنہا اس

---

[1] گنجہائے گرانمایہ ص ۳۰

تحریک کی سرکوبی کے لئے سر سے کفن باندھ کر میدان میں کود پڑے اور اپنی تقریر و تحریر کے ذریعہ مسلسل جہاد کرتے رہے۔

ماہ رجب المرجب ۱۳۳۹ھ بمطابق مارچ ۱۹۲۱ء کو بریلی شریف میں خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء کی جانب سے ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ دوسرے لیڈر بھی شریک ہوئے۔ غیر شرعی حرکات کی بنا پر علمائے اہل سنت نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کیا۔ ادھر اراکین کانفرنس کا پلان تھا کہ اس میں علمائے اہل سنت کا رد کیا جائے گا۔ اور ان لوگوں نے کانفرنس کی جانب سے دو پوسٹر بعنوان "آفتاب صداقت" اور "مستعار کی چند ساعتیں" شائع کئے تھے۔ اشتہار میں علمائے اہل سنت کو منکرین و مخالفین کے القاب دے کر چیلنج کیا گیا تھا۔ اور رمز و کنایہ کے ساتھ مقابلہ کا اعلان بھی تھا۔ اس اشتہار کے چند سطر ملاحظہ ہوں:

"منکرین و مخالفین پر اتمام حجت، مسائل حاضرہ کا انقطاعی فیصلہ خدائی فرمان پہونچانے کے لئے بریلی میں جمعیۃ علماء کا اجلاس ہونیوالا ہے، سچائی ظاہر ہوگئی۔ اور جھوٹ بھاگ نکلا۔ خدا جبار و قہار کا یہ فرمان پورا ہو کر رہے گا۔"[1]

علمائے اہل سنت نے اس چیلنج کو قبول کیا اور جماعت رضائے مصطفیٰ کی جانب سے صدر الشریعہ مولانا امجد علی (مصنف بہار شریعت) نے ستر سوالات پر مشتمل سوالنامہ مرتب کر کے قائدین جماعت کو بھجوایا کہ پڑھ کر اجلاس میں جواب دیں۔ اس سوالنامے کے متعلق صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین مرادآبادی نے امام اہل سنت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کے نام ایک مکتوب میں اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے۔

---

[1] بریلی کا معرکۃ الآرا مناظرہ۔

"سیّدی دامت برکاتہم !

سلام نیاز کے بعد گذارش، حضور سے رخصت ہو کر مکان پہونچا۔ یہاں آکر میں نے "اتمام حجۃ تامہ" کا مطالعہ کیا فی الواقع یہ سوالات فیصلۂ ناطقہ ہیں۔ اور یقیناً ان سوالات نے مخالف کو مجال گفتگو اور راہ جواب باقی نہیں چھوڑی ہے"۔ اتمام حجۃ تامہ یعنی ان ستّر سوالات کو دیکھتے ہی مخالفین کے کیمپ میں اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی اور جمیعۃ والے بغلیں جھانکنے لگے۔ جب اہل سُنّت کی جانب سے اصرار بڑھا تو مولوی عبد الودود ناظم استقبالیہ جمیعۃ علمائے ہند نے یہ جواب تحریر کیا۔ "ہر کس و ناکس سے نزاع و مخاصمہ کرنا خدام ملت کے نزدیک بے نتیجہ ہے"۔ [1]

ایسے موقع پر امام اہل سُنّت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایما پر مولانا سید سُلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ کو علی گڈھ سے بُلایا گیا کہ وہاں آکر مولانا ابو الکلام آزاد سے اس مسئلہ پر گفتگو کریں اور ضرورت پڑے تو مناظرہ کریں۔ اُدھر کانفرنس والوں کی طرف سے بھی انکو دعوتی رقعہ ملا تھا۔ لہٰذا اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کا حکم پاتے ہی مولانا سید سُلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ علی گڈھ سے بریلی شریف تشریف لائے اور آتے ہی مولوی عبد الودود ناظم استقبالیہ جمیعۃ علمائے ہند کے اس ریمارک کا جواب اس طرح دیا:۔

"جلسہ جمیعۃ العلماء بریلی کا رقعہ دعوت نامہ فقیر کے پاس پہونچا۔ فقیر نے شرکت سے امر مابہ النزاع کا تصفیہ چاہا تو آنجناب اس بے بضاعت کو ناکس قرار دے کر گفتگو

---

[1] دوامع الحمید۔

سے اعراض فرماتے ہیں ـــــ رقعہ دعوت نامہ فقیر کے پاس بلا واسطہ بھیجا جائے اور گفتگو کی جب نوبت آئے تو ہر کس و ناکس کہا جائے۔ اس کے حقائق کو نزاع و مخاصمہ قرار دیا جائے۔ کیا یہی شیوۂ خدام ملت ہے۔ آخر میں نہایت ادب سے گذارش ہے کہ برائے کرم قبل نماز جمعہ فقیر کو جلسہ میں بحیثیت سائل حاضر ہونے کی اجازت دیجائے۔[1]

بالآخر ۱۴ رجب المرجب بعد مغرب بعد حضرت مولانا سید سلیمان اشرف بہاری حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں بریلوی، صدر الشریعہ مولانا امجد علی صدر جماعت رضائے مصطفےٰ صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی، ملک العلماء ظفر الدین بہاری، مولانا محمد حسنین رضا ناظم جماعت رضائے مصطفےٰ اور حضرت مولانا برہان الحق رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر مشتمل علماء اہلسنت کا قافلہ شان و شوکت کے ساتھ جمیعۃ العلماء کے پنڈال میں پہنچا۔ اسٹیج پر عمائدین جمیعۃ کے علاوہ ابو الکلام آزاد بھی موجود تھے۔ آپ نے یہاں پہلے تقریر کے لئے وقت مانگا۔ ابو الکلام آزاد نے ۳۵ منٹ کا وقت دیا۔ کیونکہ آپ کو جلسے میں شرکت کی دعوت بھی دی گئی تھی۔ آپ نے ۳۵ منٹ تک اپنے مخصوص والہانہ انداز میں ایسی دھواں دھار تقریر فرمائی کہ اراکین کانفرنس کے حواس باختہ ہوگئے اور سامعین محو ہو کر تقریر سنتے رہے۔ ان پر وجدانی کیفیت طاری تھی۔

عبد الماجد دریا بادی نے آپ کی وارفتگانہ تقریر کے مناظر کو اس طرح پیش کیا ہے:۔

"مخالفین کی طرف سے میدان خطابت کا پہلوان شہ زور ہیل تن اکھاڑے میں اتارا گیا۔ جو کشتی پہ کشتی مارے ہوئے داؤ پیچ کے استادی میں نام پائے ہوئے، اور اس نے تقریر یہ مارا وہ مارا کے انداز میں شروع کی۔ جلسہ پر ایک نشہ کی کیفیت طاری تھی اور خلافت والوں کی زبان پر وظیفے یا حفیظ کے جاری تھے۔"[2]

---

[1] بریلی کا روداد کا مناظرہ۔

[2] نقوش لاہور شمارہ ۱۹۶۷ء

مولانا سید سُلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ نے اپنی تقریر میں جہاں ان کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا وہیں ان لوگوں کی بے راہ روی وغیر شرعی حرکات کی بھی نشاندہی فرمائی اور فرمایا کہ ہمیں مقامات مقدسہ اور خلافت کے مسائل سے اختلاف نہیں اختلاف ان غیر شرعی حرکات سے ہے جن کے مرتکب خلافت والے اور جمعیۃ والے ہو رہے ہیں۔

صدرالافاضل حضرت مولانا نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمہ بھی اس کانفرنس میں علمائے اہلِ سُنّت کے ساتھ موجود تھے آپ نے مولانا سید سُلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ کی پرمغز اور مدلل تقریر کا ذکر تفصیل سے "سوادِ اعظم" مرادآباد شمارہ شعبان المعظم ۱۳۳۹ھ میں لکھا ہے۔ تلخیص ملاحظہ ہو:۔

مولانا سید سُلیمان اشرف بہاری نے اس خوبی سے تقریر فرمائی کہ اپنے اعتراضات بھی پیش کیئے اور ان کی غلطیاں بھی دکھائیں۔ مولانا کی تقریر میں قربانی ترک کرنے، شعارِ اِسلام کو چھوڑنے اور شعارِ کفر میں مبتلا ہونے کا تذکرہ تھا۔ حضرت مولانا نے یہ بھی بیان کیا کہ موالات تمام کفار سے ناجائز و ممنوع ہے۔ عام ازیں کہ نصاریٰ ہوں یا یہود۔ ایت لا ینھکم اللہ، سے موالات ہنود ثابت کرنا غلطی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مولوی عبدالباری صاحب (فرنگی محلی) کے خط کا تذکرہ بھی کیا جس میں انہوں نے لکھا کہ فقیر ان کو آپریشن کے مسئلہ میں بالکل پس رو گاندھی کا ہے، ان کو اپنا رہنما بنالیا ہے جو وہ کہتے ہیں وہی مانتا ہوں اور بتایا کہ کافر کو دینی مسئلہ میں رہنما بنانا شانِ اسلام سے کس قدر بعید ہے، یہ ایمان ہے یا کفر؟ اسی طرح مولانا سید سُلیمان اشرف صاحب اراکین خلافت کمیٹی کی بے راہیاں اور سخت فاحش شرعی غلطیاں ذکر کیں اور فرمایا کہ مسلمان گاندھی یا کسی اور کے پس رو و متبع نہیں ہوسکتے۔ مذہب کسی سلطنت پر فدا نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اپنے مذہب میں ہندوؤں سے اتحاد نہیں کرسکتے۔ ہمیں مقامات مقدسہ، خلافت اسلامیہ کے مسائل سے اختلاف

نہیں اختلاف ان حرکات سے ہے جو منافی دین ہیں۔

مولانا سید سُلیمان اشرف بہاری کی جمیعۃ کے جلسے کی تقریر کے متعلق ابوالکلام آزاد کا مقلد و معتقد مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے بھی اپنی تصنیف ذکر آزاد میں بیان کیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

"رضاخانی جماعت کے ترجمان اور خطیب مولانا سید سلیمان اشرف تھے۔ اور اس میں شک نہیں بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے، موصوف کی تقریر نے، جو بہت لمبی تھی کانفرنس کو ہلا ڈالا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب اور کچھ کہنا ممکن نہیں[1] (صفحہ ۱۲۲)

مولانا کی پُوری تقریر کو رُوداد مناظرہ بریلی میں جماعت رضائے مصطفےٰ نے شائع کی ہے اس تقریر کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:-

مسئلہ خلافت و تحفظ و صیانت اماکن مقدسہ اور ترک موالات یہ وہ مسائل ہیں جن میں صرف فقیر بلکہ تمام علماء کرام نہیں بلکہ تمام عامہ مسلمین ہمیشہ متفق اللسان ہیں، ترکوں کی خلافت یعنی قوت دفاعی ایک امر مسلم ہے، خدمت حرمین شریفین ہر مسلمان پر فرض کفایہ ہے نیز محافظت حرمین شریفین بھی ہر مسلمان پر فرض کفایہ ہے ــــــ سلطنت ترکی ہماری دینی بھائی اس پر اسلامی سلطنت، اس پر اسلامی قوت دفاعی، پھر حرمین شریفین کی خادم و محافظ، پس ان کی اعانت اور نصرت نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ تمام مسلمانان عالم پر بقدر استطاعت فرض ہے۔ یہ وہ مسائل شرعیہ ہیں جنھیں نہ میں صرف اس وقت بیان کر رہا ہوں بلکہ آج سے دو ڈھائی برس پیشتر فقیر نے لکھا، چھاپا ملک میں شائع کیا۔

میرا و نیز دیگر علمائے اہل سُنّت و جماعت کا آپ سے اختلاف اس میں ہے کہ آپ ہندوؤں سے موالات برتتے ہیں اور مسلمانوں کو حرام و کفریات کا مرتکب بناتے ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ موالات ہر نصرانی و یہودی سے ہر حال میں حرام ہے اور

قطعی حرام! یاایھاالذین اٰمنوالا تتخذوا الیھود والنصاریٰ الآیتہ۔ نصرانی اور یہودی خواہ فریق محارب ہو یا غیر محارب مطلقاً موالات ان سے حرام اور مطلقاً حرام، ہر کافر سے موالات حرام خواہ محارب ہو یا غیر محارب لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء۔

آپ حضرات انگریزوں سے تو موالات حرام بتاتے اور کافروں (ہندوؤں) سے موالات نہ صرف جائز بلکہ عین حکم الٰہی کی تعمیل بتاتے ہیں — آپنے قشقہ لگایا گاندھی جی کی جئے ایک دوبارہ نہیں بلکہ بیسوں جگہ بیسوں بار پکاری کہ مہاتما گاندھی کی جئے۔ جس طرح صلیب علامت تثلیث ہے۔ کیا قشقہ علامت شرک نہیں؟ کیا آپ کی غیرت تقاضہ کرتی ہے کہ شرک کی علامت قشقہ اپنی پیشانیوں پر لگائے؟

آپ ہمارے سامنے سمرنا وغیرہ کے مظالم بیان کرکے ہمارے جذبات ابھارتے ہیں مگر کیا ہندوؤں نے آرہ شاہ آباد کٹارپور وغیرہ میں مسلمانوں پر قربانی بند کرنے کے لئے ایسے ہی مظالم نہیں کئے؟ قرآن مجید نہیں پھاڑے؟ عورتوں کی بے حرمتی نہیں کی؟ مسلمانوں کی جانیں نہیں لیں؟ مسجدوں میں بے ادبیاں نہیں کیں؟ آج آپ سبز گنبد کی بے ادبی ہونے سے غیرت دلاتے ہیں مگر کیا آپ کے لئے یہ غیرت کی بات نہیں تھی جبکہ یہ کہکر دربار نبوت و رسالت کی اہانت کی گئی کہ:

"اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے"۔

آپ نے اس پر کیوں نہ انکار کیا؟ کیوں خاموش رہے؟

غرض مقامات مقدسہ و خلافت اسلامیہ کے مسائل میں ہمیں اختلاف نہیں، ہندستان کے مفاد کی کوششیں کیجئے، اس سے ہمیں اختلاف نہیں خلاف ان حرکات سے ہے جو آپ لوگ منافی و مخالف دین کر رہے ہیں ان حرکات کو دور کردیجئے، ان سے باز آیئے، ان کی روک تھام کیجئے، عوام کو ان سے باز رکھئے تو خلافت اسلامیہ و

مالک مقدسہ کی حفاظت، ہندستان کے ملکی مفاد کی کوششیں ہم بھی آپ کے تعاون کرنے کو تیار ہیں۔[1]

اس کے بعد ابو الکلام آزاد نے چند باتیں بطور صفائی کہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"یہاں کس نے قشقہ کی اجازت دی؟ کس نے مہاتما گاندھی کی جے پکارنے کو کہا؟ بلکہ میں خود تو مہاتما کے یہ معنی تک نہیں جانتا کہ وہ کوئی تعظیم کا لفظ ہے ——— یہاں کے کس ذمہ دار نے کہا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے؟ یہ کفر کا کلمہ کون مسلمان کہہ سکتا ہے؟ اور جئے، قشقہ وغیرہ حرکات مخالف دین پر ہم سخت نفرتیں کرتے ہیں ——— نفس موالات تمام کفار خواہ وہ حربی ہوں یا غیر حربی، یقیناً حرام اور ممنوع ہے اور ہم کب اسے جائز بتاتے ہیں ——— کوئی غیر مسلم کسی مسلم کا ہرگز پیشوا رہنا نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کی پیشوائی اور رہنمائی ایک ذات حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے ہے اور انکی نیابت سے علماء کیلئے ہے میں صاف کہتا ہوں کہ ہمارے ہندو بھائی بائیس کروڑ ہیں اگر وہ بائیس کروڑ گاندھی ہوں اور مسلمان ان کو اپنا پیشوا بنائیں اور ان کے بھروسہ پر رہیں تو وہ بت پرست ہیں اور گاندھی ان کا بت ہے"[2]

مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنی تقریر میں مسئلہ قربانی کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور اپنی گھن گرج تقریر سے سامعین کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

---

[1] اراکین جماعت رضائے مصطفےٰ بریلی روداد مناظرہ ص ۸۵

[2] اراکین جماعت رضائے مصطفےٰ بریلی۔ روداد مناظرہ ص ۸، ۹

جیسے ہی اس نے تقریر ختم کی سید سلیمان اشرف بہاری اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی تقریر کا رد کرتے ہوئے فرمایا:

"ابوالکلام صاحب کہتے ہیں کہ آیات میں تحریف کر کے ہنود سے موالات کس شخص نے جائز بتائی۔ کیا حکیم اجمل خاں صاحب ذمہ دار شخص نہیں؟ پھر ان کی مطبوعہ کاپیاں دیکھئے جس کی ہزاروں کاپیاں شائع ہوئیں ـــــ آپ کہتے ہیں قشقہ وغیرہ حرکات کی ہم نے کب اجازت دی مگر آپ نے عوام کے سامنے ہنود سے اتحاد کو کیوں اس طرح مفصل اور شرح کر کے نہیں پیش کیا کہ ان امور میں اتحاد کرو اور ان امور میں الگ رہو۔ آپ نے ان کے سامنے مجمل صورت میں اتحاد پیش کیا۔ جس سے وہ ان حرکات میں مبتلا ہوئے۔ پھر آپ ان حرکات کی ذمہ داری سے کیسے الگ ہو سکتے ہیں ـــــ خود آپ کے شہر بریلی میں گاندھی کو سپاس نامہ پیش کیا گیا جس میں گاندھی کی نسبت کہا گیا:

ع خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

کیا آپ حضرات نے اس پر کچھ انکار کیا؟ کیا آپ کا یہ سکوت آپ پر الزام نہیں لاتا؟

مولانا ابوالکلام آزاد ان الزامات پر خاموش رہے پھر سید سلیمان اشرف بہاری نے عبدالماجد بدایونی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "کہو یار تمہاری بھی کہہ دیں، تم نے گاندھی کو کہا کہ خدا نے ان کو مذکر بنا کر بھیجا ہے، یہ کفر ہے"[1]

اس پر مولانا عبدالماجد خاموش رہے۔ جب مولانا سید سلیمان اشرف کی تقریر ختم ہو گئی تو شاہزادۂ اعلیٰ حضرت خلف اکبر حجۃ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا خاں بریلوی نے فرمایا:

"ہمیں اختلاف آپ حضرات کی ان خلاف شرع و خلاف اسلام حرکات سے ہے

---

[1] ارکین رضائے مصطفےٰ روداد مناظرہ بریلی

جن میں سے کچھ مولوی سید سُلیمان اشرف صاحب نے بیان کیں اور جن کے متعلق جماعت رضائے مصطفیٰ کے ستر سوال بنام "اتمام حجۃ تامہ" آپ کو پہنچے ہوئے ہیں ان کے جواب دیجئے۔ جبتک آپ ان تمام حرکات سے اپنا رجوع نہ شائع کر دیں گے اور عہدہ برآنہ ہولیں گے۔ ہم آپ سے علیحدہ ہیں۔ اور اس کے بعد خدمت و حفاظت حرمین شریفین وہ مقامات مقدسہ و ممالک اسلامیہ میں ہم آپ کے ساتھ مل کر جائز کوشش کرنے کو تیار ہیں"۔ [1]

غرض کہ اس جلسے میں اہلِ سنّت کو نمایاں کامیابی ملی اور مخالفین کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ جس کا تذکرہ صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمۃ نے اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے نام ایک مکتوب میں کیا ہے!

"روانگی کے وقت بریلی کے ایک اسٹیشن پر ایک تاجر صاحب نے مجھ سے کہا کہ ابو الکلام جس وقت بریلی سے جا رہے تھے میں ان کے ساتھ تھا۔ وہ یہ کہتے جاتے تھے کہ ان کے جس قدر اعتراض ہیں حقیقت میں سب دُرست ہیں۔ ایسی غلطیاں کیوں کی جاتی ہیں جن کا جواب نہ ہو سکے۔ اور ان کو اس طرح گرفت کا موقع ملے"۔

میں اپنی اس مسرت کا اظہار نہیں کر سکتا جو مجھے اس فتح سے حاصل ہوئی۔ میدان مولوی سُلیمان اشرف کے ہاتھ رہا۔ حضرت کے غلاموں کی ہمت قابلِ تعریف ہے"۔ [2]

آپ ایسے جادو بیان خطیب، قادر الکلام مقرر تھے کہ آپ سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی آپ کی محفل میں آتے اور آپ کی عالمانہ، مدبّرانہ و فلسفیانہ اور بصیرت افروز تقریر سُن کر داد و تحسین بلند کئے بغیر نہیں رہ پاتے ــــــ فنِ خطابت میں آپ کو

---

[1] اراکین رضائے مصطفیٰ روداد مناظرہ بریلی ص ۱۰۹

[2] سوانح الخیر

اپنے معاصرین میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ ۱۹۴۰ء میں جب علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے چیرمین ہوگئے تو جامع مسجد میں آپ کی تقریر ہوئی۔ بعد تقریر مولانا محمد لطف اللہ علی گڈھ نے آپ کو گلے سے لگایا اور بہت تعریف کی۔

سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات گرامی سے آپ کو گہری عقیدت تھی۔ چوں کہ آپ چشتی نظامی اصدقی سلسلے سے وابستہ تھے۔ آپ کو شرف بیعت حضرت مولانا نور محمد اصدقی سے حاصل تھا۔ جو سید ناقیام اصدق چشتی علیہ الرحمہ کے مُرید و خلیفہ تھے —— آپ ایک جیّد عالم دین اور صوفی با صفا تھے۔

مولانا سید سُلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ اجمیر شریف حضرت خواجہ معین الدین چشتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عُرس پاک کے مُبارک موقع پر اکثر تشریف لے جاتے۔ آپ کی آمد پہ وہاں خصوصی جلسے منعقد ہوتے جس میں آپ کی تقریریں ہوتیں اور آپ کی تقریریں سُننے کے لئے لوگ دیوانہ وار جلسہ گاہ میں تشریف لاتے۔ اور آپ کی عرفانی و نورانی بیانات سے بھرپور مستفیض ہوتے۔

غرض کہ آپ کی خطابت کی دھوم پورے ملک میں تھی۔ اور آپ کو اپنے ہم عصروں میں اس فن میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ اچھے اچھوں کی بولتی آپ کے سامنے بند ہو جاتی تھی۔ اپنے تو اپنے غیر بھی آپ کی جادو بیانی کا گن گاتے اور آپ کی پر مغز تقریر سُننے کے مشتاق ہوتے تھے۔

ربیع الاوّل شریف کے ماہ مبارک میں ہمیشہ آپ کی دعوت الہ آباد میں ہوتی اور آپ تشریف لے جاتے۔ پہلی ربیع الاوّل شریف سے بارہویں ربیع الاوّل شریف تک "دوازدہ منزل" میں آپ کی تقریر ہوتیں "دوازدہ منزل" آپ کے ایک خاص

مرید نے جو تاجر تھے جلسہ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دینی جلسے کے لئے تعمیر کروایا تھا ـــــ اس موقع سے الہ آباد کے علاوہ دور دراز کے لوگ بھی آپ کی تقریر سے بہرہ ور ہونے کے لئے جوق در جوق تشریف لاتے اور جلسہ بحسن وخوبی کامیابیوں کی منزلوں سے گزر جاتا۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم!
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

علامہ سید سلیمان اشرف بہاری لوگوں کے اجتماع سے کبھی بھی مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ چاہے جیسا بھی مجمع ہو آپ کی تقریر کی بے باکی اور حق گوئی کبھی متاثر نہیں ہوتی تھی۔ آپ کی گرجدار آواز جہاں عوام کے مجمع میں گونجتی تھی وہیں اہلِ انتظامیہ اور خواص کی محفل میں بھی ـــــ حاضر جوابی اور بہت جلد دور کی کہہ دینا آپ کی خصوصیات میں ہیں۔ اس ذمرے میں ایک پرلطف واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔

الٰہ آباد میں ایک مرتبہ گاؤکشی کے سلسلے میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ایک غیر رسمی مصالحتی نشست منعقد ہوئی جس میں گاندھی جی، مدن موہن مالوی جی وغیرہ شریک تھے ـــــ الٰہ آباد کے ایک جید عالم دین اور مدبر رہنما مولانا فاخر الٰہ آبادی کی خواہش پر آپ کو بھی مدعو کیا گیا۔ آپ علی گڑھ سے الٰہ آباد تشریف لے آئے اور مصالحتی نشست میں شریک ہو کر کہا کہ میں مالوی جی سے سننا چاہتا ہوں کہ معاملات کیا ہیں؟ مالوی جی نے گائے کی اہمیت وافادیت اور اس کے فضائل پر بھرپور روشنی ڈالی اور کہا کہ اس سے ہندوؤں کے مذہبی جذبات وابستہ ہیں۔ موجودہ مسلمان لیڈروں نے مدن موہن مالوی جی کی گفتگو پر ہاں میں ہاں ملائی لیکن آپ اور مولانا فاخر الٰہ آبادی سنجیدگی کے ساتھ مالوی جی کی باتوں کو سنتے رہے جیسے ہی مالوی جی نے اپنی تقریر ختم کی آپ (سید سلیمان اشرف بہاری) اٹھ کھڑے

ہوئے اور بہت ہی اطمینان کے ساتھ اپنے مخصوص دلچسپ انداز میں فرمایا کہ میں بھی چاہتا ہوں کہ ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کا قتل نہ کیا جائے لیکن سب سے پہلے مالوی جی سے ان کے دیوی دیوتاؤں کی مکمل فہرست لے لی جائے تاکہ اس مسئلہ کو ہم لوگ گفت و شنید کے ذریعہ طے کرلیں اور روز روز کا جھگڑا ختم ہوجائے۔ پورے مجمع سے آواز آئی ہاں ہاں بہت صحیح ہے، مولانا نے گاندھی جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کل مالوی جی اور ان کے ہمنوا یہ مطالبہ کر بیٹھیں کہ مسلمان اپنے بچوں کا ختنہ نہ کرائیں کیوں کہ ہم لوگ لنگ پوجا کرتے ہیں اور مسلمانوں کی اس حرکت سے ہمارے نازک مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے تو بتائیے اس وقت مسلمان کن دشواریوں میں مبتلا ہوں گے۔ آپ نے اسے سنجیدگی کے ساتھ کہا لیکن پوری مجلس منھ پر رومال رکھ کر ہنسنے لگی۔ گاندھی جی آہستہ سے کھسک گئے اور مالوی جی شرم سے پانی پانی ہوگئے۔[1]

آپ کی خطابت کا شہرہ دُور دُور تک تھا۔ آپ کے پاس اکثر دُور دراز سے دعوتی خطوط پہنچتے رہتے لیکن عدیم الفرصتی کی بنا پر آپ ہر جلسہ میں شرکت نہیں کرتے۔ ہاں اگر کہیں تشریف لے جاتے تو وہاں کے لوگ آپ کی آمد سے فائدہ اُٹھانے کی غرض سے فوراً کسی جلسہ کا انعقاد کر ڈالتے جس سے مولانا کی مقبولیت اور ان کی تقریر میں جادوئی اثر کا پتہ چلتا ہے۔ آپ جب اپنے آبائی وطن بہار شریف تشریف لے جاتے تو لوگ آپ کی آمد کی خبر سُن کر آپ کی تقریر کا لطف اٹھانے اور اپنی دینی معلومات میں بے پناہ اضافہ کی غرض سے جلسہ جلوس کا اہتمام کر لیتے ـــــ حالانکہ آج کا مزاج یہ ہے کہ کسی بھی مقرر کو اس کے اپنے علاقہ میں اتنی اہمیت نہیں دی جاتی

---

[1] ماہنامہ۔ رفاقت پٹنہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۸۹ء

جتنی کہ باہر ہیں۔ لیکن مولانا سید سلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ کی خصوصیت ہے کہ آپ خاص و عام دونوں میں یکساں مقبول نظر آتے ہیں ـــــــ جب بھی اپنے دل میرداد پور بہار شریف تشریف لے جاتے تو وہاں ضرور ہی آپ کی آمد پہ جلسے منعقد ہوتے اور ان جلسوں میں بہار شریف اور اطراف بہار شریف سے آنے والے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ صرف یہ معلوم کرانے کی ضرورت تھی کہ مولانا سید سلیمان اشرف بہاری کی تقریر ہونے والی ہے۔ سامعین کو آپ کی تقریر میں صرف زور بیانی کا لطف اور جملوں کی رنگا رنگی کا حسن ہی نہیں ملتا بلکہ کیف و سرور کے حسین سرمایہ اور معلومات کے بے بہا خزانے سے بھی ان کے قلب مالا مال ہوتے۔ ایک جلسہ کی کیفیت سید بدرالدین نے اپنی تصنیف "عظیم آباد کی تہذیبی داستان" کے صفحہ ۲۰۶ پر یوں بیان کیا ہے:

صبح ۸ بجے نواب نصیرالدین مرحوم کے عالیشان مکان میں (محفل میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم) منعقد تھی۔ صرف بہار شریف کے نہیں بلکہ اطراف و جوانب سے آئے ہوئے بے شمار لوگوں کا بڑا مجمع تھا۔ یہ خبر نکل چکی تھی کہ مولانا سید سلیمان اشرف بہاری کی آج تقریر ہوگی۔ ٹھیک ۹ بجے مولانا تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ جیسے جیسے ان کی تقریر بڑھتی گئی، مجمع پر بے خودی کا عالم چھاتا گیا۔ ہر شخص نقش بہ دیوار بنا ہوا لذت بیان میں محو تھا۔ آنکھیں مولانا کی باوقار چہرہ پر لگی ہوئی تھیں اُن کے منھ سے نکلنے والے الفاظ دلوں میں محبت رسول کی طغیانی پیدا کر رہے تھے۔ جوش و مستی میں ہر شخص اپنے سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ وقت گزر رہا تھا۔ منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ آفتاب نصف النہار سے ڈھل کر پچھم کی طرف نیچے جانے لگا۔ دوپہر کے دو بج چکے تھے یکایک کسی کو ہوش آیا ـــــــ اس نے مجمع کو چونکانے کے لئے ایک گوشے میں کھڑے ہو کر اذان پکارا ز مولانا کی تقریر سے پیدا شدہ بے خودی کا طلسم ٹوٹا۔[1]

---

[1] عظیم آباد کی تہذیبی داستان ص ۲۰۶

تصنیف و تالیف

آپ جہاں ایک نامور خطیب اور قادر الکلام مقرر تھے وہیں ایک محقق اور صاحبِ قلم بھی تھے آپ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں اور مقالات و مضامین لکھے، مختلف کتابوں پہ مقدمات و حواشی تحریر کیے۔

آپ کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابوں کو بہت زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

(۱) المبین (۲) النور (۳) الارشاد (۴) النہار (۵) الحج وغیرہ۔

المُبین

یہ کتاب مستشرق جرجی زیدان کی کتاب "فلسفۃ اللغۃ العربیہ" کا مدلل جواب ہے۔

فلسفۃ اللغۃ العربیہ میں مصنف نے عربی زبان وادب کے خلاف قلم اٹھایا تھا۔ اس نے اپنی عصبیت کی بنا پر اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ عربی زبان بھی دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح دیگر زبانوں سے خلط ملط ہو کر بنی ہے۔ اور مصنف نے خالص عربی الفاظ کو یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ لفظ فلاں زبان سے لیا گیا ہے یہ لفظ فلاں زبان سے لیا گیا ہے اور اس نے یہ بھی لکھا کہ عربی میں الفاظ کی کمی ہے۔ غرضکہ عربی زبان سے عصبیت اس کی تصنیف کی ہر سطر سے پھوٹی پڑتی ہے۔

"المُبین" میں سید سلیمان اشرف بہاری نے اس کے تمام اعتراضات کا مدلل و مفصل جواب دیا ہے اور اس پر بحث کرتے وقت مفید مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ جسے پڑھ کر جہاں قاری کے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے وہیں لطف و سرور بھی حاصل ہوتا ہے ـــــ مولانا نے عربی زبان کی اہمیت، افادیت اور اس کی دوسری زبانوں پہ فوقیت پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) عربی زبان کے خصوصی فضائل۔

(۲) مخارج صفات اور القاب کی تفصیل۔

(۳) ترکیب حروف۔

(۴) ایک سو خطابیت کا اندفاع۔

(۵) فلسفہ ارتقت انسان۔

(۶) فلسفہ اشتقاق۔

(۷) عربی زبان کی حیرت انگیز کمال گویائی۔

پہلے باب میں سید سلیمان اشرف علیہ الرحمہ نے زبان کے طرق وضع پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ زبان کی وضع کیوں کر ہوئی۔ انسان اول کی زبان کیا تھی اور اس کا علم اس کو کیسے حاصل ہوا۔ رب کائنات نے بواسطہ الہام اس کی تعلیم فرمائی یا خود انسان نے اپنے گرد و پیش کے حالات اور جذبات سے متاثر ہو کر الفاظ کی تخلیق کی؟ اس سلسلے میں انھوں نے دو مکتبہ ہائے فکر کے اقوال و عقائد پیش کئے ایک اشعری دوسرا معتزلی۔

مکتبہ اشعری کے نزدیک زبان کی تخلیق الہام سے ہوئی ہے یعنی حضرت آدم کو جب اللہ تعالی نے پیدا کیا تو انھیں گفتگو کے لئے الفاظ بھی سکھلائے اور جب اس دنیا میں آئے تو الفاظ کی وحی بھی ان کی جانب ہوتی رہی اور یہی الفاظ مجموعی شکل میں زبان کی صورت اختیار کر لئے۔

دوسرا مسلک آپ نے معتزلی کا بیان کیا ہے کہ ان کا عقیدہ اور خیال یہ ہے کہ انسان دنیا میں روزمرہ کی زندگی میں اپنے ماحول اور نفس کی تحریکات سے متاثر ہو کر خود الفاظ وضع کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا نے معتزلی کے بھی تین گروہ بتائے

ہیں اور ان کے نظریات و عقائد بتاتے ہوئے ان کے اقوال کو اس کتاب میں پیش کیے ہیں۔ طوالت کی وجہ کر تفصیل سے عبارت نہیں پیش کیا جا رہا ہے۔

غرضیکہ پہلے باب میں زبان کی تخلیق کے بارے میں آپ نے پر زور بحث کی ہے اور دوسری زبانوں کے مخارج اور ان کے لسانی حیثیت کو دکھاتے ہوئے عربی زبان کی وسعت کو دکھایا ہے اور اس کی ابتری ثابت کی ہے۔

دوسرے باب میں "مخارج و صفات و اعراب حروف" کے عنوان سے مضمون قلمبند کیا ہے اور اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ آپ نے عربی کا سنسکرت سے بھی موازنہ کیا ہے۔ جو مستشرقین کے نزدیک عربی سے بھی زیادہ قدیم زبان ہے۔ آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ سنسکرت میں حروف تہجی ادا کرنے کے مخارج صرف آٹھ ہیں جبکہ عربی میں اٹھارہ ہیں۔ اس مسئلہ پر آپ نے محققانہ انداز میں بحث کی ہے جس سے آپ کی دور بین نگاہ اور وسعت مطالعہ کا پتہ چلتا ہے ——— اعراب و حرکات مخارج و صفات حروف بیت صوتی اور معنی و مفہوم کی وضاحت فرماتے ہوئے اس باب میں عربی زبان کی اہمیت و افادیت کے متعلق عرض کرتے ہیں۔

"کیا ماہرین علم السنہ زبان عربی کا مقابل یا مماثل کسی اور زبان کو قرار دے کر اس فیصلہ میں امین کہے جائیں گے؟ کیا وہ اپنے دعوے پر دلیل لا کر یہ ثابت کر سکیں گے کہ سوا عربی کے کوئی اور زبان بھی ہے جس کی صوت کا اس اتفاق کے ساتھ اعلیٰ کیا ہو یا اس کے حروف ترکیبی سے معنی اور فصاحت کا نشوونما ہوتا ہو؟ اگر یہ مسئلہ کچھ بھی ثبوت کی قابلیت رکھتا تو آج یورپ کے مصنفین اس محققانہ خیال کا اعتراض کرتے کہ زبان باہمی مفاہمہ سے وضع ہے"۔

ـــــــــــــــــــــــــــــ

سے دیکھو ص ۹۵

تیسرے باب میں ترکیب کے متعلق بیان کیا ہے اور آپ نے وضاحت کی ہے
کہ عربی الفاظ میں دو دو حرفوں کی باہمی آمیزش سے لفظ کے معنی قریب و قریب ہوجاتے
یعنی دو حرفوں کو ملا کر جو نیا مرکب تیار ہوگا ——— دونوں حرفوں کے ملنے سے گرچہ
ایک نیا معنی پیدا کرے گا۔ مگر پھر بھی ان دونوں کی مماثلت کی بنیادی خصوصیت
نفس مشترک موجود ہوگا۔ اس سلسلے میں آپ نے الفاظ کے ذریعہ مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

جرجی زیدان یہودی نے اپنی کتاب "فلسفۃ اللغۃ العربیۃ" میں یہ ثابت
کرنے کی کوشش کی ہے کہ عربی الفاظ کا مادہ صرف دو ہیں یعنی عربی کے تمام الفاظ
ثنائی ہیں۔ تین یا چار حرف سے کوئی لفظ نہیں بنتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کئی
دلیل بھی پیش کی تھی۔ آپ نے "المبین" کے چوتھے باب میں اس کے پرفریب
دعوے کی بھرپور تردید فرمائی ہے اور فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز میں بحث کرتے ہوئے
ثابت کیا ہے کہ عربی لفظ کے مادے کی تکمیل محض دو حرفوں سے نہیں ہوتی بلکہ ایک
تیسرے اصلی حرف کے ملانے کی ضرورت پڑتی ہے اور تیسرا حرف جو ملتا ہے وہ ہرگز زائد
نہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

" عربی زبان کے اسماء و افعال کا مادہ کبھی اور کسی حال میں تین حرف سے کم کا ہوتا
ہے نہ سلف و خلف سے آج تک کوئی اس کا قائل ہوا۔ تیسرا حرف اصل مادہ کا جز
ہے ہرگز حرف زائد نہیں۔"[۱]

پانچواں باب۔ فلسفۂ ارتقاء لسان سے متعلق ہے۔ اس باب میں آپ نے فطرت
ارتقاء لسانیت پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور اس سلسلے میں محققین کی رائے اور مفید
مثالیں پیش کی ہیں۔

---

[۱] المبین ص ۱۰۲۔

آپ لکھتے ہیں:۔

"یہاں تک میں نے کافی وضاحت کے ساتھ اس بیان و تحقیق کو جسے دُنیا کے دورِ اجتہاد و انکشاف کا تازہ و لذیذ ثمر سمجھا جاتا ہے مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے ضخیم سے ضخیم کتاب پڑھ کر دیکھو ماحصل اس کا یہی ہوگا جو میں نے ملخصاً لکھ دیا ہے"

اگرچہ یہ کوئی ایسا مسلک نہیں جس کی طرف ابتداءً اہلِ یورپ کا ذہن منتقل ہوا ہو اس لئے کہ یہ وہی ابو ہاشم معتزلی کا مسلک ہے جس کا ذکر ابتدائی صفحات میں گزر چکا ہے لیکن ہاں اسی مسلک کا احیا اور جہد و جہد سے اس کی پرورش و تنمیہ البتہ وقتاً فوقتاً علماء یورپ کرتے رہے اور یہی ان کی سعی و کوشش کا مایہ ناز طرۂ افتخار ہے۔

مجھے اس وقت نہ زبان کی تاریخ کا بیان کرنا مقصود ہے نہ اس حقیقت کا پتہ لگانا ہے جسے آفرینش زبان و بیان کے سنگ بنیاد کا مرتبہ حاصل ہے نہ یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ کون کون سی زبان اصل ہے اور کون کون زبان فرع ہیں۔ نہ بابل بیشوا کے کھنڈروں میں بھٹکتے پھرنے کی حاجت نہ مقابر وغیرہ کے کتبات پر دیدہ ریزی کی ضرورت، نہ اصل و فرع میں مجانست کی جستجو نہ ایک فرع کو دوسرے فرع کو پہلو بہ پہلو قائم کرنے کی آرزو یہ کام اس کا ہے جو تہمات و بے بنیاد مفروضات پر مقصد فاسد حاصل کرنے کے لئے دماغ پاشی اور دیدہ ریزی کو تحقیق انیق اور انوکھا اجتہاد جانتا ہے۔ اور اسے علم بالآثار کے شورش و اقعب سے ملقب کرکے ماؤف دماغ سے خراج تحسین وصول کرنا چاہتا ہے۔

بلکہ میرا مدعا صرف اس قدر ہے کہ کمال کا جو معیار زبان کے لئے قرار دیا جائے عربی زبان اس میں ایسی کامل ثابت ہوگی کہ دوسری زبانیں اس کے مقابلہ پر لائی نہیں جا سکتی۔ پھر اس مرتبہ کمال میں جو خصوصیات اور آئین و ضوابط کی مراعات یہاں ہونگی

اس سے ظاہر ہے کہ عربی قدامت میں بھی اس قدر آگے بڑھی ہوئی ہے کہ دوسری زبانیں اسکے سامنے اپنی قدامت کا بھی دعویٰ نہیں کرسکتیں۔[1]

چھٹا باب : فلسفہ اشتقاق پر مشتمل ہے اس میں اشتقاق صغیر و کبیر کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ اور ان کا فرق بتایا گیا ہے۔

جرجی زیدان نے بعض ایسے عربی الفاظ کو جو عربی الاصل ہیں عجمی قرار دیا ہے اور اس نے اپنی تصنیف میں غیر عربی لفظ ثابت کرنے کی مذموم کوشش کی ہے۔ آپ نے اپنے زبردست قوت استدلال سے ثابت کیا ہے کہ یہ الفاظ عجمی نہیں بلکہ عربی ہیں اور آپ نے عربی و عجمی میں تمیز کرنے کے اصول بھی لکھے ہیں۔ آپ اس باب میں ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:

"جرجی زیدان جسے تعصب کے جنون نے دیوانہ بنا رکھا ہے اس نے تو کئی ضخیم جلدیں اس موضوع پر لکھ کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ نہ صرف الفاظ بلکہ ضمائر، اسماء موصول اور اسماء اشارہ تک عربی میں کسی اور ہی زبان سے منقول ہو کر آئے ہیں۔ اس جوشش جنون کا جواب دینا تو کسی خاطر العقل کا ہی کام ہے۔ میں معذور ہوں۔ ہاں بعض ایسے الفاظ جنھیں خود علماء لغت عربیہ نے عجمی کہدیا ہے میں اس موقع پر ان کی تشریح کئے دیتا ہوں۔ اہل علم اسی نمونہ پر میزان قائم کر کے عجمی و عربی کو خود وزن کر لیں گے۔"[2]

ساتواں باب میں عربی زبان کا حیرت انگیز کمال گویائی بیان ہے اس باب میں یہ بحث کی گئی ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کا صرف یہی کمال نہیں کہ ان میں اپنے معنی کے ساتھ ایک نظم و تناسب پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے کئی لفظوں مثلاً علم۔ درس۔ سبق۔ ارض اور راس کا فلسفہ کھول کر بیان کیا ہے اور عربی الفاظ کی

---

[1] المبین ص ۱۳۲، ۱۳۳

[2] المبین ۱۸۱

وسعت کو مفصل طور پر بیان کیا ہے ایک جگہ مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں:

"آدمی کا بچہ جب تک شکم مادر میں ہے اسے جنین کہتے ہیں۔ پیدا ہوا تو ولید ہے۔ سات دن تک ایسا کمزور اور غیر حساس رہتا ہے کہ دودھ کھینچنے کی بھی اس میں قابلیت نہیں ہوتی ان ایام میں صدیغ ہے۔ دودھ پینے کی قابلیت ہو گئی تو امیغ ہے۔ اب دودھ چھوٹا تو فطیم ہے۔ کچھ نشوونما پایا اور شیر خوارگی کی سستی اس سے رفع ہوئی زمین پر کھسکنے لگا تو اس کا نام دارج ہے۔ دودھ کے دانت ٹوٹنے لگے تو مثغور ہے۔ دودھ کے دانت گر کر پھر نکلنے شروع ہوئے تو متغر ہے۔ دس برس یا اس سے کچھ زیادہ عمر کا ہوا تو مترعرع ہے۔ اب بلوغ کی عمر قریب آگئی تو یافع یا مراہق ہے۔ بالغ ہوا قویٰ میں توانائی آئی تو حزوّر ہے۔ پھر ان تمام مدارج عمر کے لئے ایک لفظ غلام کا عام ہے اب سبزہ و خط نمودار ہوا "باقل" ہے۔ سبزہ بڑھکر سیاہ خط ہو گیا تو "فتی" یا "شارخ" ہے۔ داڑھی مونچھ اچھی طرح نکل آئی چہرہ بھر گیا تو "مجتمع" ہے۔ چالیس سے متجاوز ہوا اور ساٹھ تک نہیں پہونچا ہے تو "کہل" ہے۔[1]"

اس طرح آپ نے مختلف مثالیں لفظوں کے ذریعہ پیش کئے ہیں۔

جرجی زیدان کے اعتراضات کے جہاں آپ نے بخیے ادھیڑے ہیں وہیں عربی لسانیات سے متعلق بے بہا معلومات کے خزانے اور اپنی ذہنی کاوش و محققانہ تدبر سے کتاب کو انمول بنا دیا ہے۔ البیین کو مشہور مستشرق پروفیسر براؤن نے دیکھ کر کہا ——— مولانا نے اس عظیم موضوع پر اردو میں یہ کتاب لکھ کر ستم کیا، عربی یا انگریزی میں ہوتی تو کتاب کا وزن اور وقار بڑھ جاتا۔[2]"

سنہ ۱۹۲۹ء میں جب البیین کی پہلی بار اشاعت ہوئی تو منظر عام پر آتے ہی اہل علم

---

[1] البیین صفحہ ۲۰۔ [2] تذکرہ علما اہل سنت۔ صفحہ ۱۰۰

وضعں کے حلقوں میں کافی سراہا گیا اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر سر اقبال مرحوم کو بھیجا اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد (علامہ) اقبال اپنے لکچروں کے سلسلے میں علی گڈھ تشریف لائے کھانے پر ایک جگہ مرحومین کی ملاقات ہو گئی۔ البین کا ذکر چھڑ گیا۔ علامہ سر اقبال نے بڑی تعریف کی اور فرمایا مولانا آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جنکی طرف پہلے میرا ذہن منتقل نہ ہوا تھا۔[1]

النور میں آپ نے خلافت کمیٹی والوں کے غیر اسلامی نظریات و غیر شرعی حرکات کے بخئے ادھیڑ کر رکھ دیئے ہیں۔ اور ان کا شرعی نقطہ نظر سے محاسبہ فرمایا ہے۔ نام نہاد مسلم لیڈر جو گاندھی جی کو ہی اپنا پیشوا اور رہنما سمجھ بیٹھے تھے۔ ان کی آپ نے اس کتاب میں خوب خبر لی ہے۔

الرشاد النور کے بعد آپ نے ارشاد لکھا جس میں جمعیۃ العلماء و خلافت کمیٹی و دیگر مسلم گاندھیائی لیڈر جو گاندھی جی کو اپنا پیشوا اور رہنما سمجھ بیٹھے تھے اور شرعی بے راہ روی میں مبتلا تھے۔ ان کے غیر شرعی حرکات پر تنقید کی اور یہ ثابت کیا کہ یہ قوم مسلم اور دین اسلام کے لئے زہر ہلاہل ہیں۔

النور اور الرشاد کے منظر عام پہ آتے ہی مخالفین نے آپ کے خلاف زبردست طوفان کھڑا کیا۔ اور آپ کی زبردست مخالفت ہونے لگی۔ اخبار و رسائل کے ذریعہ آپ کی ذات پر رکیک حملے کئے گئے لیکن آپ نے ان کا بغیر نوٹس لئے ہوئے عزم و استقلال کے ساتھ خلافت کمیٹی والوں کی گمراہ کن تحریک کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ اور اپنے زور بیان و سیف قلم کے ذریعہ ان کی غلط روش کیخلاف تحریک چلائی۔

سید بدر الدین اپنی تصنیف "عظیم آباد کی تہذیبی داستان" میں آپ کے جہاد

---

[1] گنجہائے گرانمایہ صفحہ ۳۸

اعتدال کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

ترکِ موالات کے دور میں جب اکثر علماء نے فقہی مسائل کو سیاسی تمتع بنانے سے بہنا شروع کیا جس سے مولانا کے عقیدے کے خلاف ایک نیا مذہبی پیراہن تیار ہونے لگا تھا۔ مولانا سے نہ رہا گیا اور انھوں نے اپنے خلوت خانے میں بیٹھے بیٹھے قلم اٹھایا اور اپنے قلم کی جنبش سے اس نئے پیراہن کے سارے تانے بانے ادھیڑ کر رکھ دیے۔ یہ عجیب معرکہ تھا دنیا دیکھ رہی تھی کہ ایک گوشہ نشین مولوی تند سیلاب کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے اور لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ طوفان کی گرج کے خلاف ایک آواز جو کسی گوشے سے اٹھ رہی تھی وہ گرج کی شورش آہنگ کا پہلو دبائے جا رہی تھی۔ بالآخر دنیا نے دیکھ لیا کہ کس طرح کچھ دنوں بعد اس گوشہ نشین مولوی نے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا اور چڑھتے ہوئے دریا کو اتر جانا پڑا۔

اس ضمن میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی بھی تحریر ملاحظہ فرمائیں!

بالآخر مولانا نے ان مباحث پر قلم اٹھایا اور دن رات قلم برداشتہ لکھتے رہتے اٹھتے بیٹھتے مجھے سناتے اور رائے طلب کرتے۔ کہتا میری مذہبی معلومات اتنی نہیں ہیں کہ انکار کر سکوں۔ آپ جو کہتے ہیں ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ کہتے یہ بات نہیں ہے تم پر اس ہنگامے کا اثر ہے اور سمجھتے ہو کہ یہ تمام عالم جو کچھ کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے اور میں کوئی کاوڑی یوں ہی ہانکتا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہم تم زندہ رہیں تو دیکھ لیں گے کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق پر۔

سیلاب گزر گیا، جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا لیکن مرحوم نے اس عہدِ سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی۔ اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا، آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ سارے علماء سیلاب کی زد میں آ چکے تھے، مرحوم اپنی جگہ پر قائم تھے۔ اس کا اعتراف کسی نے نہ کیا اور نہ کبھی مرحوم نے کہا کہ

میں نے آپ نے ان کی اس خدمت اور قابلیت کا اعتراف کیوں نہیں کیا؟[1]

”سنہ ۱۹۴۷ء کا زمانہ ہے جس کو اپریشن کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے“ گلے کی لت ریلی کے سوالات پر بڑے بڑے جید اور مستند لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ اس زمانہ کے اخبارات، تقاریر، تصانیف اور رجحانات کا اب اندازہ کیجئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ کہا جا رہا ہے وہی سب کچھ ہے۔ یہی باتیں ٹھیک ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور بات ٹھیک ہو نہیں سکتی تھی کالج میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی مرحوم مطعون ہو رہے تھے لیکن چہرہ پر کوئی اثر نہ تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق اس زمانے اسی دو منزلے کے پیچھے کمروں میں رہتا تھا اور میرے اور مرحوم کی نشست کے کمروں میں صرف ایک دیوار حد فاصل تھی جس میں ایک دروازہ بھی تھا۔ دن میں کئی کئی بار ملنے کا اتفاق ہوتا۔ کہتے تھے رشید دیکھو علما کس طرح لیڈروں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں اور لیڈروں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو کیسا گھر گھروندا بنا رکھا ہے۔ میری سمجھ میں اس وقت ساری باتیں نہیں آتی تھیں اور نہ میں ان تفصیلات میں پڑنا چاہتا تھا لیکن مرحوم پر ایک خاص کیفیت طاری رہتی تھی وہ رہ رہ کر ان ہی باتوں کو چھیڑتے تھے اور کہتے تھے کہ میں جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ کالج اس قسم کے مناقشوں کا مرکز بنے لیکن کیا کروں خدا کو تو بعد میں منہ دکھانے کا موقع ملے گا اس دنیا کے پڑھے لکھے کیا کہیں گے۔“

الانہار: یہ کتاب آپ نے فارسی شعر و ادب کی تاریخ میں لکھی جو بہت مقبول ہوئی اور اس زمانے کے عربی و فارسی و اردو کے محقق و ادیب

---

[1] گنجہائے گرانمایہ ص ۲۸ - ۲۹

مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے الاجہار کے متعلق کہا کہ یہ کتاب شبلی نعمانی کے شعر العجم سے بہتر ہے۔

الحج :- یہ کتاب حج کے موضوع پر ہے اس کتاب میں حج کے ارکان و مسائل پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ حجاج کرام کے لئے یہ کتاب رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا سید سلیمان اشرف بہاری کی کاوشوں میں ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ نے علامہ فضل حق خیرآبادی کی بے مثال تصنیف امتناع النظیر پہلی دفعہ ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ سے شائع کیا اور اس نایاب تصنیف کو علمی دنیا میں متعارف کرایا۔ اس اہم اور نایاب تصنیف کی اشاعت گویا جماعت اہل سنت پر ایک احسان ہے کیوں کہ اس کتاب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر کے ممتنع بالذات ہونے پر جو دلائل و براہین قائم کئے گئے ہیں یہ عقائد اہل سنت کے لیے بے بہا سرمایہ ہیں۔

حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کی مثنوی "ہشت و بہشت" پر مولانا نے حواشی تحریر فرمائے ساتھ ہی ایک پر مغز مقدمہ بھی لکھے جو بڑے سائز کے ۲۰۵ صفحات پر مشتمل ہے یہ بھی اُردو ادب میں ایک گراں قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقدمہ میں مصنف نے حضرت امیر خسرو کے تمام اصناف سخن پر تبصرہ کیا ہے اور دکھایا ہے کہ اردو اور فارسی شاعری پر عربی شاعری کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ آپ کا یہ مقدمہ بھی علمی حلقہ میں کافی مقبول ہوا۔ ان کے علاوہ بھی آپ کی کئی تصنیفات ہیں جو اپنی نوع کے اعتبار سے جامع اور مفید ہیں۔

تعلیمی مہارت آپ جہاں ایک قادر الکلام مقرر، دُور بین محقق صاحب طرز ادیب ایک عظیم مدبر اور بہترین معلم تھے۔ وہیں آپ کی حیثیت ماہر تعلیم کی بھی تھی سن ۲۶-۱۹۲۵ء میں جب علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے میٹرک سے لے کر ایم اے

تک کی شعبہ دینیات کے لئے نصاب مرتب کرنے کی ضرورت پڑی تو نصاب مرتب کرنے والی کمیٹی میں دیگر ماہرین تعلیم میں آپ بھی شامل تھے۔ نصاب کے مرتب کرنے میں اس کمیٹی کی کارکردگی کا ذکر سُلیمان ندوی نے معارف اعظم گڈھ میں اس طرح کیا ہے:

"منتظمین یونیورسٹی کی دعوت پر چند ایسے علماء جو جدید ضروریات سے آگاہ اور نصاب ہائے تعلیم اور درس گاہوں کا تجربہ رکھتے تھے علی گڑھ میں جمع ہوئے اور متواتر سات اجلاس میں جو ۱۱ر فروری سے ۱۷ر فروری تک منعقد ہوتے رہے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سمجھا اور اس کے آخر تک نقشۂ عمل اور ایک نصاب میٹرک سے ایم اے تک کا تیار کر کے یونیورسٹی کے سامنے پیش کر دیا اس مجلس کے ارکان حسب ذیل اصحاب تھے:

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا سید سُلیمان اشرف صدر علوم شرقیہ، مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد امجد علی صدر مدرس مدرسہ معینیہ عثمانیہ اجمیر اور خاکسار مولانا عبدالعزیز میمن، استاد عربی ادبیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے بھی خاص موقعوں پر شرکت کی۔ علوم مشرقیہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا (۱) عقلیات (۲) دینیات (۳) ادبیات۔"[۱]

ظرافت

مولانا ایک خوددار طبیعت، اصول پسند انسان تھے، مزاج میں شدت بھی تھی اور یہ شدت ایمانی تھی نفسانی نہیں، کسی کا رعب ہرگز برداشت نہیں کرتے اپنی زندگی بڑی شان و شوکت اور طنطنہ کے ساتھ گزاری کسی کی جی حضوری ہرگز گوارا نہ تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ معززین کے لئے عزت اور عزیزوں سے شفقت بھی رکھتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ ظریفانہ انداز میں باتیں بھی کرتے لیکن اس ظرافت میں بھی آپ کو اپنی شخصیت کا پورا پورا خیال تھا۔ کبھی بھی ان کی ظرافت و خوش طبعی سے گنوار پن کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ آپ کے اس خوش طبعی اور ظریفانہ گفتگو کے متعلق

---

[۱] سید سلیمان ندوی شذرات، معارف اعظم گڈھ فروری ۱۹۲۶ء

رشید احمد صدیقی نے اپنی تصنیف "گنجہائے گرانمایہ" میں کئی واقع لکھے ہیں ساعت فرمائیں،
"باتوں ہی باتوں میں ایسے ایسے فقرے اور لطیفے کہہ جاتے کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی، ہر بات بے ضبط زبان کہتے "بے ضبط زبان" انہیں کا فقرہ ہے کبھی کبھی ایسے الفاظ اور فقرے بھی کہہ جاتے جو ثقاہت کی زبان پر نہیں آتے۔ لیکن اس بے ساختگی سے اور اتنا برجستہ کہتے کہ اس لفظ کی بدنمائی کی طرف ذہن منتقل نہ ہوتا۔ ان کی یا آرنگیں عادت تھی، کبھی کبھی بہار کا کوئی لفظ بول جاتے اور کہہ دیتے کہ یہ خاص ہمارے دیار کا لفظ ہے، ایسا جامع لفظ کہیں اور نہ ملے گا"[1]

ایک بزرگ دینیات کے نصاب سے دلچسپی لینے لگے مقررہ نصاب کی کتابوں پر جہاں تہاں نشانات لگا کر مرحوم کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ توقع یہ تھی کہ مرحوم تبادلہ خیالات سے ان کی عزت افزائی فرمائیں گے۔ مرحوم نے تحریری کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک صاحب سے یہ البتہ کہلا دیا کہ کتابیں موصول ہوئیں۔ انہوں نے اسی کو غنیمت سمجھا۔ ایک دن حلقہ چائے نوشی میں آکر شریک ہوئے اور تھیالوجی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "آپ کو دینیات سے کیا واسطہ، آپ کے اپنے مشاغل کیا کم ہیں کہ دینیات کی طرف توجہ فرمائیں" وہ صاحب خفیف ہو کر خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں آموں کا تذکرہ آ گیا۔ اس میں نوارد نے بڑے انہماک سے حصہ لینا شروع کیا۔ مرحوم نے فرمایا ٹھیک ہے اس پر گفتگو کیجئے ملاحظہ فرماتے ہو نا یہ آپ کا حق ہے"[2]

مرحوم کے یہاں ایک بڑے سن رسیدہ بڑے بزرگ اور بڑے جید عالم ٹھہرے ہوئے تھے آپس میں بے تکلفی تھی ورنہ ظاہر ہے اس خانقاہ میں کون بار پا سکتا تھا، چلے کی سردی تھی، مرحوم حسب معمول برآمدہ میں سو رہے تھے اور مہمان کمرہ کے اندر، مہمان تہجد کی نماز

---

[1] گنجہائے گرانمایہ صفحہ ۴۲ [2] ایضاً ۳۹

پڑھنے اُٹھے، دروازہ کھولنے پر مرحوم کی آنکھ کھل گئی، پوچھا کون؟ جواب ملا کوئی نہیں میں ہوں۔ بولے خیر تو ہے۔ کہا وضو کروں گا۔ بولے تو کیجئے نا نیند کیوں حرام کرتے ہیں۔ انھوں نے دبی زبان سے کہا، تھوڑا گرم پانی مل جاتا۔ فرمایا جہنم میں ملے گا۔ مہمان نے کہا مقررارشاد ٹھیر پورے طور پر سمجھ نہ پایا، بولے گرم پانی جہنم میں ملے گا۔ انھوں نے جواب دیا تو اُٹھو راہ بتاؤ، مرحوم نے قہقہہ لگایا، بولے نیند تو غارت کی لیکن فقرہ خوب کہا۔

ایک بار چائے نوشی کی صحبت گرم تھی۔ سارے درویش موجود تھے۔ ایک صاحب تھے جن کو خانقاہ شیلمانیہ میں الف ممبری کا درجہ حاصل تھا۔ لیکن اکثر بار پا جاتے تھے مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے علم و فضل کا تذکرہ تھا کہ متذکرہ صدر بزرگ بھی آپہنچے، یہ مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے شاگرد تھے، چنانچہ آنے کے ساتھ ہی گفتگو میں شریک ہو اور تعریف و توصیف میں سب سے پیش پیش نظر آنے لگے۔ مرحوم نے چائے کا ایک دہکتا دہکتا نیم جرعہ لیتے ہوئے فرمایا بھائی میں تو مولانا لطف اللہ مرحوم کی کرامت کا قائل ہوں۔ نو وارد نے تعجب میں آکر پوچھا، یہ کیونکر مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا " اور جو انھوں نے آپ کو پڑھا دیا یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے "

دینیات کے گھنٹے میں اکثر طلبا، لکچر کم سُننے حاضری کی زیادہ فکر رکھتے اور تھوڑی بہت گفتگو سے بھی باز نہ آتے۔ لیکن مولانا کی کلاس میں نظم و سکوت قائم رہتا۔ مرحوم سے طلبا مسرور بھی رہتے اور مرعوب بھی۔ ایک دن طالب علم نے کلاس میں دریافت کیا۔ جناب والا حضرت عمرؓ نے حضرت خالد بن ولید کو فوج کی سرداری سے معزول کر دیا تو حضرت خالد نے حضرت عمرؓ سے معزولی کی وجوہ کیوں نہ دریافت کرلے۔ اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا حضرت خالد نے جب وجوہ دریافت نہیں کئے، تیرہ سو سال بعد اب آپ کو وجوہ دریافت کرنے کی کیا ضرورت لاحق ہوئی، سمجھے نا، بندہ نواز، ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالا

لیجئے، آگے بڑھیے!"[1]

آپ لوگوں کو ان کے اوصاف کے مطابق خطابات سے بھی نوازتے اور کچھ لوگ تو آپ کے عطا کردہ خطابات سے بہت مشہور ہوگئے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کو آپ نے "کالا کافر" کا خطاب دیا تھا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وہ "کالا کافر" کے لقب سے مشہور ہے جس کا تذکرہ رشید احمد صدیقی نے گنجہائے گرانمایہ کے صفحہ ۹۳ میں کیا ہے۔

"مولانا سید سلیمان اشرف صاحب مرحوم جیسے پکے مسلمان اور کھرے انسان تھے سب جانتے ہیں مولوی عبدالحق صاحب سے بڑی دوستی و بے تکلفی تھی۔ اردو، اسلام، تہذیب ثقافت اور اس طرح کے دوسرے مسائل پر دونوں بڑے لطف کی گفتگو ہوا کرتی۔ مولوی صاحب جب کبھی علی گڑھ آتے۔ خانقاہ سلیمانیہ میں مولانا کے یہاں چائے پیتے اور ان کی بے تکلف و دلچسپ گفتگو سننے کے لئے حلقہ نشیمن جمع ہو جاتے۔ عربی کے صفات پر مولانا زور دیتے مولوی صاحب اردو کے گن گاتے۔ یہ صحبتیں سالہا سال رہیں۔ مولانا نے مولوی صاحب (عبدالحق) کو کالا کافر کا لقب دے رکھا تھا اور ہم لوگوں کو اپنے یہاں کی نشست کی خوت ہی یہ کہکر دیتے تھے فلاں وقت آجانا کالا کافر آیا ہوا ہے۔"

آپ کی اپنے بھائی سے محبت

آپ کے ایک بڑے بھائی تھے جن کا نام سید انیس اشرف تھا۔ جوانی میں ایک سرکاری ملازمت سے وابستہ تھے لیکن دورانِ ملازمت عین جوانی کے عالم میں ان کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ جس کی وجہ سے نوکری چلی گئی۔ آپ نے (سید سلیمان اشرف بہاری) ان کو اپنے ساتھ رکھا اور بھرپور علاج کروایا لیکن مرض کا افاقہ نہ ہوا۔ تاحیات انیس اشرف

---

[1] گنجہائے گرانمایہ صفحہ ۵۷-۵۶

اس مرض میں مبتلا رہے۔ آخر دم تک مولانا نے اپنے ساتھ رکھا اور انھوں نے بڑی وفاداری کے ساتھ کفالت فرمائی ——— آپ اپنے ہاتھوں سے ان کو کھانا کھلاتے، اپنے پاس سلاتے، سفر و حضر ہر جگہ ساتھ رکھتے۔ کسی کے یہاں دعوت بھی ہوتی تو ان کو ساتھ لیکر جاتے یا اگر کوئی معزز مہمان آجاتے تو بھی اپنے سے جدا نہیں فرماتے بلکہ ان کو بھی مہمانوں کے ساتھ بٹھاتے۔ وہ بالکل خاموش رہتے نہ کسی کی باتوں کا جواب دیتے اور نہ کسی سے کچھ کلام کرتے۔ بلکہ چپ چاپ ادھر ادھر پھرا کرتے ——— جب بھی اپنے بڑے بھائی کا یہ عالم دیکھتے تو آپ پر پریشانی کی عجیب کیفیت ہوتی۔ اس کا تذکرہ پروفیسر رشید احمد صدیقی اس طرح کرتے ہیں:

"بھائی بیمار ہوئے تو مرحوم کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ مریض اپنا حال نہیں بتا سکتا تھا معدہ کی تکلیف تھی۔ حکیم عبداللطیف صاحب لکھنوی معالج تھے۔" "بھائی کی بیماری میں مرحوم کا یہ عالم تھا کہ کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے، سونے، بیٹھنے کی کوئی فکر نہ تھی۔ لباس میلا، خط بڑھا، اوقات مقررہ میں گڑبڑ، گفتگو میں ناہمواری، کہتے تھے نفس نے اپنے مطالبات چھوڑ دیئے ہیں۔ حکیم صاحب نے نہایت محبت، ہوشیاری اور جانفشانی سے علاج کیا۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات، دوائیں، آش جو، شربت اور دیگر ضروری چیزیں گھر سے تیار کرا کے بھیجتے۔ ضروری مشاغل سے فرصت پا کر مریض کے پاس آجاتے، ہر طرح کے جتن کئے لیکن ایک پیش نہ گئی اور "بھائی جان" مولانا مرحوم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔"[۱]

سید انیس اشرف عرف سید سلیمان اشرف سے دو سال قبل انتقال کر گئے تھے چونکہ جوانی کے عالم میں ہی جنون کا مرض لگ گیا تھا جس کے سبب انکی شادی نہیں ہوئی تھی۔

---

[۱] گنجہائے گراں مایہ۔ ص ۵۱

مولانا کی شادی

مولانا سید شاہ سلیمان اشرف بہاری نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ تجردانہ طور پر گذارا۔ اس درمیان آپ کی والدہ باحیات تھیں ان کا ہمیشہ اصرار رہا کہ شادی کرلیں۔ بالآخر ان کی ضد پر مولانا راضی ہو گئے اور تقریباً چالیس سال کی عمر میں نکاح کیا —— شادی کے چند سال بعد مولانا کی والدہ محترمہ بھی انتقال فرما گئیں۔ والدہ کے انتقال کے چند سال بعد آپ کی اہلیہ محترمہ بھی آپ کو داغ مفارقت دے گئیں۔

آپ علی گڈھ میں تھے کہ ایک اور بہار شریف سے روح فرسا خبر سننے کو ملی یعنی ان کے جگری دوست مولوی سلیمان احمد جو بہار شریف میں رہ رہے تھے ان کا انتقال ہو گیا۔ مولانا خبر پاتے ہی بہار شریف تشریف لائے اور مرحوم کے گھر کے لوگوں کی تعزیت فرمائی۔ اور ان کے بڑے لڑکے سید منیر الدین کو اپنا منھ بولا بیٹا بنا کر علی گڈھ اپنے ساتھ لیتے آئے۔ ان کی تعلیم و تربیت ایسی کی جیسے اپنی نسبی اولاد کی کی جاتی ہے۔ اس درمیان ان کے گھر کی بھی کفالت فرماتے رہے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ اور تاحیات آپ سید منیر الدین کے اخراجات کے کفیل رہے۔ وصال سے قبل آپ نے جہاں اپنے خاندان اور وارثین کو اپنی جائداد و رقم سے ان کے حقوق ادا کئے وہیں سید منیر الدین کو بھی کافی رقم دی۔ اور اپنی رہائش کیلئے جو مکان علی گڈھ میں تعمیر کی تھی وہ ان کے نام وقف کیا۔

مرض الموت

آپ کی اہلیہ اور بھائی کے انتقال کر جانے پر آپ بالکل ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ اکثر مغموم رہتے۔ حزن و ملال کی وجہ کر دن بدن صحت تیزی سے گرنے لگی۔ رمضان شریف کے مہینہ میں بخار آیا، طبیبوں نے روزہ رکھنے سے باز رکھنے کی کوششیں کی لیکن آپ نے کسی کی نہ سنی اور ایام علالت میں بھی رمضان کا روزہ ترک نہیں کیا۔ طبیعت دن بدن بگڑتی چلی گئی بعض احباب نے معالج بدلنے کو کہا لیکن آپ نے منع فرمایا —— جب مرض حد سے زیادہ بڑھ گیا اور علاج سے افاقہ نہ ہوا تو خود شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب (جو آپ کا علاج کر رہے تھے) نے

مشورہ دیا کہ اب معالج بدل کر دیکھا جائے کہ کیا ہوتا ہے۔ ممکن ہے میری سمجھ میں مرض نہ آتا ہو یا میری تدبیر کارگر نہ ہوتی ہو۔ اپنے معالج کی یہ گفتگو سُن کر آپ پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی۔ فرمایا "حکیم یہ سمجھتے ہو کہ مولوی مر گیا تو لوگ کہیں گے کہ حکیم صاحب کے علاج سے مرا۔ خبردار! خبردار!! مت گھبرانا۔ علاج تمہارا ہی رہے گا مارنا جلانا تمہارا کام نہیں ہے یہ تو کوئی اور کرتا ہے تم فکر مت کرو علاج کئے جاؤ مجھ سے زیادہ کون جانے گا کہ علاج کیسا ہو رہا ہے۔ علاج قیامت تک نہیں بدلا جائے گا۔ سمجھے نا؟ ہاں!
اور حکیم صاحب علاج فرماتے رہے اس درمیان آپ تندرست ہو گئے لیکن دوبارہ جب علیل ہوئے تو صحت گرتی چلی گئی۔ آپ کے وصال کی کیفیت رشید احمد صدیقی نے یوں بیان فرمایا ہے۔

"دوسری بار علیل ہوئے تو حالت گرتی ہی گئی۔ اس دوران عرصہ تک حاضر نہ ہو سکا۔ دریافت کرنے پر ہمیشہ یہی معلوم ہوا کہ کمزوری بڑھتی جاتی ہے اور مرض قابو میں نہیں آ رہا ہے۔ میں اس حالت میں مرحوم کو نہ دیکھ سکتا تھا جس شخص کو تندرستی، زندہ دلی، استقلال و استقامت کا جیتا جاگتا نمونہ دیکھ چکا تھا اسے بے بس و ناتواں دیکھنا میرے بس کا نہ تھا۔ ایک دن مکان پر ایک اہم کام میں مصروف اور پرو وائس چانسلر کے خط کا منتظر تھا کہ نوکر نے آکر خبر دی کہ مولانا صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ سب لوگ وہیں گئے ہوئے ہیں۔ زبان سے بے ساختہ اِنّا للہ نکلا، گرتا پڑتا دو منزلہ پہنچا، ہجوم دیکھ کر دل بیٹھ گیا کمرے میں سب لوگ جمع تھے کئی ڈاکٹر بلائے گئے تھے۔ مشورہ ہو رہا تھا معلوم یہ ہوا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ غفلت طاری ہونے لگی ہے۔ کبھی کبھی ہوش میں آجاتے ہیں علاج بدلنے پر اب بھی تیار نہیں ہیں۔ عرض کیا کہ جو کچھ ہونے والا ہے اسے اب کوئی ٹال نہیں سکتا، علاج بدلنا نہ بدلنا دونوں برابر ہیں۔" دل البتہ نہیں مانتا۔ شائد ڈاکٹری علاج سے صورت حال بہتر ہو جائے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر جو مرحوم کے سب سے مقرب و محترم تھے۔

اندر تشریف لے گئے۔ میری اب بھی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا۔ مرحوم کی حالت غیر ہو چکی تھی"

بالآخر علم و ادب کا درخشندہ ستارہ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ بمطابق ۲۷ اپریل ۱۹۳۹ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔ علی گڑھ میں آپ نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا اور علیگڑھ میں ہی آپ کا وصال ہوا۔ شروانیوں کے قبرستان میں دفن کئے گئے جہاں آپ کا مزار شریف ہے۔ تذکرہ علمائے اہل سُنّت میں تاریخ وصال رمضان المبارک لکھا ہے جو غلط ہے۔

ابرِ رحمت تیرے مرقد پر گہر باری کرے
حشر تک شانِ کریمی ناز برداری کرے

رشید احمد صدیقی نے آپ کے جنازے کا منظر اس طرح پیش کیا ہے۔
جنازہ کے ہجوم میں قبرستان پہنچا۔ قبرستان سے متصل میدان میں نماز کے لئے جنازہ رکھ دیا گیا اور ان لوگوں کا انتظار کیا جانے لگا جو دفن میں شریک ہونے کے لئے دوڑتے بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ نماز پڑھانے کا سب سے زیادہ حق نواب صدر یار جنگ بہادر کو پہنچتا تھا۔ اچانک علالت کے سبب سے موصوف تشریف نہ لاسکے۔ مولانا ابوبکر صاحب منہ کے زخم رسنے کے سبب سے معذور تھے۔ چنانچہ مولانا شفیع صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس وقت جبکہ نماز جنازہ کا مسئلہ زیر غور تھا۔ مرحوم کی ایک بات یاد آئی۔ عرصہ ہوا ایک بار فرمایا تھا: دیکھو! دینیات کے پرچے میں جو نماز جنازہ کا سوال میں ہمیشہ رکھ دیتا ہوں اس کا سبب جانتے ہو، میں نے لاعلمی ظاہر کی تو فرمایا کہ ہر مسلمان جو اپنے بھائی کے ساتھ آخری سلوک کر سکتا ہے۔ وہ نماز جنازہ ہے۔ میں مرنے لگوں تو مجھے یہ تو اطمینان رہے گا کہ میرا ہی کوئی عزیز طالب علم میری نماز جنازہ پڑھائے گا۔
اس وقت جبکہ یہ نہیں طے ہو رہا تھا کہ نماز جنازہ کون پڑھائے۔ مجھے مرحوم کی بات

بے اختیار یاد آئی اور یہی جی چاہا کہ مرحوم ہی کو کوئی شاگرد نماز جنازہ پڑھائے۔ کاش میں ہی پڑھا سکتا۔ لیکن توفیق ہوئی تو بس اتنی کہ جس جگہ مجھے نماز جنازہ پڑھانی چاہیے تھی وہیں تعزیت کا ریزولیوشن پڑھ کر گھر واپس آگیا اور نماز جنازہ کا بدل تعزیت کا ریزولیوشن رہ گیا۔[1]"

آپ کی وفات پر مولانا ابوبکر جو علالت کے باوجود جنازے کے ساتھ قبرستان گئے۔ انھوں نے کہا۔ "افسوس ہے سردار اٹھ گیا۔"[2]

سلمان ندوی نے لکھا ہے:

چار سلمانیوں کی رباعی قاضی محمد سلیمان صاحب کی وفات سے مثلث ہو گئی تھی۔ شاہ سلیمان پھلواری کی رحلت سے وہ فرد بن گئی تھی۔ اب اخیر اپریل ۱۹۳۹ء میں مولانا سلیمان اشرف صاحب (استاذ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) کی موت سے مصرع ہو کر رہ گئی۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ مصرع بھی زبان پر کب تک رہتا ہے

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں[3] "

رشید احمد نے کہا:

"اللہ نے اپنے بہادر کو ہم سے اٹھا لیا[4]"



---

۱ گنجہائے گرانمایہ ص ۹۶
۲ گنجہائے گرانمایہ ص ۹۸
۳ سید سلیمان ندوی معارف اعظم گڈھ جون ۱۹۳۹ء ص ۴۰۲۔
۴ گنجہائے گرانمایہ ص ۹۶۔